راوی فاؤنڈیشن کے زیرِ اہتمام مسلسل اشاعت کا 20 واں سال

Monthly
Arxang
Lahore

ماہنامہ
ارژنگ
لاہور

مدیر اعلیٰ: عامر بن علی

مدیر: حسن عباسی

مئی 2019ء

قرآن کا منظوم مفہوم لکھنے کی سعادت میرا قابلِ فخر ایوارڈ ہے

ریڈیو پاکستان کے ملتان سنٹر سے
پہلی نسوانی آواز میری نشر ہوئی تھی

نامور شاعرہ، کالم نویس، ادیبہ اور سفرنامہ نگار

ڈاکٹر شہناز مزمل

سے مدیرِ اعلیٰ ارژنگ معروف شاعر، کالم نگار، سفرنامہ نگار

عامر بن علی

کا مکالمہ

ڈاکٹر شہناز مزمل کے تعارف میں اتنا بتا دینا ہی کافی ہے کہ انہیں مادرِ دبستان لاہور کہا جاتا ہے۔ تمام زندگی شعر و ادب کی خدمت میں گزاری اور گزشتہ کئی دہائیوں سے ادب سرائے کے نام سے ایک ادبی تنظیم چلا رہی ہیں جو کہ پاکستان کے شاعروں اور ادیبوں کے درمیان باہمی ملاپ اور ملاقات کا سبب ہونے کے ساتھ ساتھ ادب کی ترویج کا بھی انتہائی اہم ادارہ ہے۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ارژنگ کے قارئین کے لیے گفتگو کا موقع انہوں نے دیا۔ یہاں یہ ذکر بھی بے جا نہ ہوگا کہ یہ گفتگو ان سے عمرے کے سفر پر روانہ ہونے سے چند گھنٹے پہلے کی گئی۔

• جائے پیدائش انسان کی شخصیت کے بارے میں بہت سارے سوالات کا جواب دیتی ہے۔ آپ کب اور کہاں پیدا ہوئیں؟

میں فیصل آباد میں پیدا ہوئی تھی۔

• آپ کا شمار ان اہلِ حرف میں ہوتا ہے جو روایتی تعلیم میں بھی نمایاں کامیابیاں سمیٹنے میں کامیاب رہے۔ اپنی تعلیمی زندگی پر ذرا روشنی ڈالیے؟

میں نے لائبریری سائنس میں ایم اے کیا تھا، پھر اس کے بعد ہالینڈ سے ڈی ایچ ایم ایس (DHMS) کیا لیکن میں سمجھتی ہوں کہ درسی تعلیم آپ کی علمی سمت کا تعین کرنے میں مدد دیتی ہے۔ مگر اصل تعلیم آپ خود ہی مطالعے سے حاصل کرتے ہیں۔

(مکمل انٹرویو اندرونی صفحات)

راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیر اہتمام مسلسل اشاعت کا 20 واں سال

Monthly
Arxang
Lahore

عالمی سطح پر اردو ادب کا ترجمان

ماہنامہ ارژنگ لاہور

جلد نمبر 20 — مئی 2019 — شمارہ نمبر 5

مدیر اعلیٰ ◉ عامر بن علی

مدیر ◉ حسن عباسی

{مجلس ادارت}

ڈاکٹر صغرا صدف ◉ ابرار ندیم ◉ لبنیٰ صفدر

{مجلس مشاورت}

ڈاکٹر جعفر حسن مبارک ◉ ظفر خان (آسٹریلیا) ◉ ارشد نذیر ساحل (چین)

کمپوزنگ ◉ زریاب کمپوزنگ : 0321-4730769 زرزاز ◉ نعمان حسن : 0333-4918383

آرٹ اینڈ گرافکس ◉ محمد احسن گل : 0300-4529821

پتہ برائے خط و کتابت

ماہنامہ ارژنگ

F-3 الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

حسن عباسی : 0300-4489310 اعزازی : 0301-4492133

nastalique786@gmail.com

سالانہ ممبر شپ

ماہنامہ "ارژنگ" کے سالانہ خریدار بننے کے لیے مندرجہ ذیل نام اور شناختی کارڈ پر مبلغ -/1000 روپے
بذریعہ ایزی پیسہ، موبی کیش، یو پیسہ یا پی او ایل ادبی سے رقم بھیجیں اور سالانہ خریدار بن جائیں۔ مکمل کاپی اعزازی بھیجی جائے گی۔

حسن محمود 0300-4489310 شناختی کارڈ نمبر 31204-7298386-9

فہرست

حمد و نعت / ، ۲

مضامین:
- ناستیلجیا ۔ ایک پرافسانہ داستان / ڈاکٹر جاوید اقبال
- خط بنام انور مقصود / امین کنجاہی ، ۱۸
- ایک تماشہ / صدف منیر ، ۲۰
- تیرا خیال اور میں / ساحل سلہری ، ۲۳
- عبدالوحید کل اور ایک پل / اجمل نذیر ، ۲۴
- نعت گو شاعر مظفر وارثی / سعدیہ سیٹھی ، ۲۷

طنز و مزاح
- میں جاناں لاہور / احمد سعید ، ۲۸
- مستنصر حسین تارڑ / صبوحہ خان ، ۲۰

شاعری ۲۹

افسانے
- تم زندہ رہو گے / مصطفیٰ کریم ، ۳۰
- افسانہ / خالد محمود قریشی ، ۳۲
- تیری میری چاہت / حمیرا انجم ، ۳۳
- سرپرست / ناہید وحید ، ۳۴

شاعری ۴۰

سفرنامہ
- ترقی کا راز / عامر بن علی ، ۴۱

شعری گوشے:
- آغا ثنارہ، گل فراز ، ۴۳ تا ۴۴

شاعری ، ۴۵
- انٹرویو: ڈاکٹر شہناز مزمل ، ۴۶
- انٹرویو: لبنیٰ صفدر ، ۴۷

مختصر ادبی خبریں ، ۵۳

تبصرہ کتب ، ۵۴

خطوط ، ۵۶

Far East Marketing Co.

Samaria Mansion 605 Koenji-Minami 1-6-5
Suginami-Ku, Tokyo, 166-0003 Japan
E-mail: femc1@hotmail.com

کیسی چیخ و پکار ہے صاحب
مجھ میں صوت ہزار ہے صاحب
دھیان اپنا کبھی نہیں آیا
میرے سر پر سوار ہے صاحب
سہا سہا سہا سٹ کے رہتا ہوں
ہر طرف بے شمار ہے صاحب
میں بظاہر تو ٹھیک لگتا ہوں
میرے اندر بخار ہے صاحب
رات دن دم درود ہوتے ہیں
پھر بھی سینے پہ بار ہے صاحب
کون آ کر بجاتا ہے اس کو
دل کے اندر ستار ہے صاحب
باری سے پہلے سرخرو کرنا
بڑی لمبی قطار ہے صاحب
حمد کہہ کر جسے سناتا ہوں
یہ لہو کا فشار ہے صاحب
حسن عباسی/لاہور

میرے سرکارؐ کا جو گدا ہو گیا
مہرباں اس پہ میرا خدا ہو گیا
انؐ سے فریاد کی گھونٹ بھر کی اگر
مجھ پہ رحمت کا دریا فدا ہو گیا
جان دی کربلا میں تو بولے حسینؓ
دین کا حق یوں نانا ادا ہو گیا
آپؐ سے آقا نسبت مری جڑ گئی
میری بخشش کا بھی آسرا ہو گیا
میرے چہرے کی افسردگی ٹل گئی
خاکِ طیبہ ملی دل ہرا ہو گیا
آیا جھونکا ہوا کا مدینے سے جب
انؐ میں میرا ہر اک غم ہوا ہو گیا
نامِ احمدؐ لیا اور سکوں پا لیا
آپؐ کا ذکر میری دوا ہو گیا
انؐ کے قربان جاؤں میں عنبر سدا
جو بھی مانگا مجھے وہ عطا ہو گیا
سیدہ سعدیہ عنبر جیلانی/

آپؐ کی رحمت نے کیسا کر دیا
جو تھے ادنیٰ انؐ کو اعلیٰ کر دیا
دھوپ تھی سر پر گناہوں کی مرے
آپؐ نے رحمت کا سایہ کر دیا
اُمتی ہوں آپؐ کا یہ ناز ہے
آپؐ کی نسبت نے اُونچا کر دیا
خشک میرے دل کا جو تالاب تھا
آپؐ کی رحمت نے دریا کر دیا
آپؐ کی نظرِ عنایت مرحبا
تھا مریضِ جاں اچھا کر دیا
آپؐ کا تاجِ غزالی ہو گیا
آپؐ نے ایسا اشارہ کر دیا
غزالی/گوجرہ

ہے آپؐ کی شان ارفع و اعلیٰ، شہرِ والا
ہے آپؐ کا ہر سمت اُجالا، شہرِ والا
چھوڑا ہے مجھے لوگوں نے جب رنج و الم میں
تب آپ نے ہے مجھ کو سنبھالا، شہرِ والا
جس وقت نکیرین سوالات کریں گے
میں آپ کا دے دوں گا حوالہ، شہرِ والا
ہو بھیک عطا مجھ کو بھی سرکارؐ کرم کی
منگتوں کو نہیں آپ نے ٹالا، شہرِ والا
میں گردشِ دوراں کے اندھیروں میں گھرا ہوں
مل جائے مجھے نور کا ہالہ، شہرِ والا
چھوئے گی مجھے کیسے بھلا آتشِ دوزخ
ہے پاس مرے عشق کی مالا، شہرِ والا
گن آپ کی عظمت کے وہ گاتے ہیں ہمیشہ
جو آپ کا کھاتے ہیں نوالہ، شہرِ والا
ہو جائے کرم مجھ پہ تو ہے بندہ نوازی
گھیرا جو مصائب نے ہے ڈالا، شہرِ والا
میں تنگیٔ حالات کی ہوں غار میں آقا
ہے آس کہ مکڑی بنے جالا، شہرِ والا
دن رات یہی مانگتا رہتا ہوں دعائیں
اللہ کرے کفر کے منہ پہ لگے تالا، شہرِ والا
میں ڈوب چلا تھا کہ پڑھی نعت بھنور میں
بس موجِ کرم نے ہے اُچھالا، شہرِ والا
کام آئی ہے سرکار کی اب مدح سرائی
نعتوں نے ہے مشکل سے نکالا، شہرِ والا
ساجد کہاں قابل تھا مگر آپ نے اس کے
الفاظ کو ہے نعت میں ڈھالا، شہرِ والا
محمد امین ساجد سعیدی/حاصل پور

لتا منگیشکر - ایک پُر افسانہ داستان

ڈاکٹر امجد پرویز/لاہور

مغنیہ لتا منگیشکر کے متعلق مختلف ناقدان موسیقی نے بہت کچھ تحریر کیا ہے مگر یہ امر مُستند ہے کہ جب میں نے آنکھ کھولی تو اُن کا گایا ہوا گیت "آئے گا آنے والا" میری سماعت کو چُھو گیا۔ یہ گانا اُنہوں نے فلم "محل" کے لئے گایا تھا۔ اور اس کو اُس وقت کی نووارد خوبصورت اداکارہ مدھوبالا کو بالمقابل نوجوان ہیرو اشوک کمار پر فلمایا گیا تھا۔ خوبصورت 'لائٹ اور شیڈ' (Light and shade) ماحول میں 'اشوک کمار' اس نغمے کو گانے والی رُوح کا متلاشی نظر آیا۔ آج چھ دہائیوں کے گزرنے کے بعد بھی یہ نغمہ اُسی طرح دلکش لگتا ہے۔ جسطرح کہ انیس سو پچاس کی دہائی میں تھا۔ فلم 'محل' کی کامیابی کے پیچھے 'کمل رائے کی ایڈیٹنگ کا بھی ہاتھ تھا۔ افسوس کہ کھیم چند پرکاش اس فلم کے لئے اپنی دی ہوئی موسیقی کی کامیابی کا جشن منائے بغیر، فلم کی نمائش سے دس روز قبل ہی 10، اگست 1950ء کو اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے۔

موسیقار ایس۔ ڈی برمن کا تخلیق کردہ، ہدایتکار شاہد لطیف کی 1951ء میں بننے والی فلم "بُزدل" کا گیت 'جھن جھن جھن پائل باجے' بھی میرے بچپن کی حسین یادوں کے جُھرمٹ سے جھانکتا ہے۔ خاص طور سے اس وجہ سے بھی کہ نجی محافل میں، میری خالہ پروفیسر ذکیہ مالک، اس گیت کو اپنی مدھر اور سُریلی آواز میں گاتی تھیں۔

لتا اور انیل دا:

موسیقار انیل بسواس جنہیں فلم انڈسٹری میں پیار سے "انیل دا" پکارا جاتا تھا نے فلم "آرزو" کے لئے 1950ء میں چند خوبصورت گیتوں کی دُھنیں تشکیل دیں۔ ان گیتوں میں سب سے نمایاں گیت "کہاں تک ہم اُٹھائیں غم' جئیں اب یا کہ مر جائیں" بہت ہی سُریلا اور درد بھرا گیت تھا۔ مرکزی کردار دلیپ کمار اور کامنی کوشل نے ادا کئے تھے۔ معاون اداکار گوپ تھے جو کہ اپنی کامیڈی یا کردار نگاری کی وجہ سے الگ پہچان رکھتے تھے۔ اس فلم کا ایک اور گیت "انہیں ہم جو دل سے بھلانے لگے" بھی مدھم لے میں ایک سریلا گیت تھا۔ لیکن دو اور گیت "کوئی پیار کی بولی بول گیا، میرا زخم کریجوا ڈول گیا" اور جانا نہ دل سے دُور، آنکھوں سے دُور جا کے" میں نہیں بُھول پایا ہوں۔ دراصل 1940ء اور 1950ء کی دہائیوں میں انیل بسواس ایک انتہائی کامیاب موسیقار مانے جاتے تھے۔

اُن کی کامیابیوں میں اس امر کا بھی بہت عمل دخل ہے کہ انہوں نے فلمی موسیقی میں مکمل آرکسٹرا استعمال کرنے کی ریت ڈالی۔ حالانکہ میری ناقص رائے میں اُن کے چند گیت کم سازوں کے استعمال کے باوجود، کامیابی کی سیڑھی چڑھنے میں کامیاب رہے تھے۔ فلم "ترانہ" کی موسیقی اب بھی، اُس نسل کے سُر شناس لوگوں کی نفسیات پر اثر انداز ہے۔ اب اس گیت کو ہی لے لیجئے۔ "وہ دن کہاں گئے بتا جس نظر میں پیار تھا" استھائی سے پہلے دو ہڑا کیا خبر تھی کہ محبت میں یہ دن آتے" کیا سادگی اور سُریلے پن سے نہ صرف گوایا گیا بلکہ اس کو کس معصومیت کے ساتھ خوبصورت اداکارہ مدھوبالا نے فلمایا تھا۔ جذبات کی گہرائی اور گیرائی، اس نغمے کی موسیقی کی نمایاں خصوصیت ہے۔ لیکن جو گیت مجھے سب سے زیادہ پسند ہے، وہ سدا بہار گیت "سینے میں سُلگتے ہیں ارمان" ہے جسے طلعت محمود اور لتا منگیشکر نے گایا تھا۔ انیل بسواس نے گلوکار طلعت محمود، مکیش اور گلوکارہ لتا منگیشکر کو پدرانہ شفقت سے نوازا، اُنکی آوازوں کی قدرتی خوبیوں کو اُبھارا اور حوصلہ افزائی فرمائی۔

یہ بات خاص طور سے قابل ذکر ہے کہ انیل دا نے لتا منگیشکر کو نور جہاں کی گائیکی کے نفسیاتی اثر سے آزاد کرنے میں اُن کی بہت معاونت فرمائی۔ اس کے علاوہ انہوں نے لتا جی! کو گاتے وقت سانس پر قابو رکھنے کا طریقہ بھی سکھایا۔ میں نے اپنی کتاب 'میلو ڈی میکرز' میں ذکر کیا ہے کہ انیل بسواس نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ اگر آر۔ سی۔ بورال (رائے چند) ہندی سینما کا باپ تھا تو وہ (انیل بسواس) ہندی سینما کے چچا ہیں۔ انہوں نے لتا منگیشکر کی آواز کو سنوارا اور پھر اُسکا سریلا استعمال کیا، اُس سے اس انانیت زدہ (egocentric) بیان کی سچائی جھلکتی دکھائی دیتی ہے۔ اور پھر جب ہم انیل بسواس کی موسیقی میں فلم "ہمدرد" میں لتا منگیشکر اور منا ڈے کے گائے ہوئے گیت "رتو آئے رتو جائے سکھی ری" اور "پی بن سُونا جی" سُنتے ہیں تو یہ تاثر مزید تقویت اختیار کر لیتا ہے۔ ان گیتوں سے انیل بسواس کا راگ ودیا پر دسترس کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ بعد از ذکر گیت میں راگ گوڈ سارنگ، راگ گوڈ ملہار، راگ جوگ اور راگ بہار کا گلدستہ پیش کیا گیا ہے۔ فلم "ترانہ" کے اُن گیتوں کے علاوہ جن کا ذکر مندرجہ بالا سطور میں رقم کیا گیا ہے۔ چند اور گیتوں کا ذکر لازم ہے کہ جنہوں نے میری نفسیات پر گہرا اثر چھوڑا ہے۔ یہ گیت ہیں:

☆موہ سے اُوڈھ گیو مورا سانوریا، کس کی لگی بیری نجریا
☆یوں چھپ چھپ کے، چُپ چُپ کے تیرا آنا، یاد رہے بھول نہ جا
☆بے ایمان تورے نینوا نندیا نہ آئے
☆واپس لے لے یہ جوانی
☆نین ملے نین ہوئے باورے (دوگانہ مع طلعت محمود)

آخر میں، یہ گزارشات نامکمل ہوں گی اگر ہم انیل بسواس کی لتا منگیشکر کیلئے بنائی ہوئی دُھنوں کا ذکر نہ کریں جو کہ انہوں نے فلموں "آرام" (1952ء)، "دوراہا" (1952ء) "آکاش" (1953ء) اور "فریب" (1953ء) کے لئے ترتیب دیں۔ ان میں جو گیت خصوصی ذکر کے قابل ہیں، وہ یہ ہیں:

☆بالموا نادان، سمجھائے نہ سمجھے جی کی بتیاں (آرام)
☆من میں کسی کی پریت جگائے، او متوالے (دوراہا)
☆سارا چمن تھا اپنا (آکاش)
☆سوگئی چاندنی (آکاش)

لتا منگیشکر کے دیگر موسیقاروں کے ساتھ گائے ہوئے گیتوں کا احاطہ کرنے سے پیشتر، اگر ہم اُن کے تاریخی پس منظر پر ایک طائرانہ نظر دوڑائیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔

تاریخی پس منظر:

لتا منگیشکر کی پیدائش اندور کے قصبہ "ہولکار" میں 8 ستمبر 1929ء کو ہوئی تھی۔ نامور موسیقار ماسٹر غلام حیدر کی پیشین گوئی کے مطابق، لتا منگیشکر نے بہت جلد ہی بمبئی کی فلم انڈسٹری میں اپنا نام پیدا کر لیا۔ کمپیوٹر سائٹ "سنگیت محل" کے مطابق لتا کا بچپن مستحکم نہیں تھا۔ اُن کے والد ماسٹر دینا ناتھ کے انتقال کے بعد اُن کے والد کے ایک قریبی دوست وینائک دامودر کرناٹکی نے اُنہیں گود لے لیا، بلکہ سارے بہن بھائیوں (چار بہنیں اور ایک بھائی) کو سرپرستی دی۔ وینائک کی یہ دیرینہ خواہش تھی کہ نہ صرف لتا، بلکہ سارے بچوں کو خود کفیل کرنے میں اقدام اُٹھائے۔ لتا کے دیگر بھائیوں کے نام آشا، اوشا، مینا اور ہردے ناتھ تھے۔

لتا کی پہلی ریکارڈنگ:

یہ بات قابل ذکر ہے کہ ماسٹر وینائک، مشہور اداکارہ نندا کے والد تھے۔ جن اقدام کا میں نے مندرجہ بالا سطور میں ذکر کیا ہے، اُس منزل کی طرف پہلا قدم لتا کی آواز میں پہلا گیت فلم "پہلی منگلا گور" کے لئے تھا۔ مگر بدقسمتی سے یہ فلم تکمیل کے مراحل طے نہ کر سکی۔ مگر ماسٹر وینائک اُس وقت کے لکھاری اور نائب ہدایتکار وسنت جوگلیکر کو منانے میں کامیاب ہو گیا کہ وہ لتا کی آواز میں 1942ء میں بننے والی فلم "کٹی حصال" میں ایک گیت ریکارڈ کرلے۔ اس لحاظ سے موسیقار "سداشیو راؤ نورریکر" تیرہ سالہ شرمیلی لڑکی کو ریکارڈنگ سٹوڈیو میں لایا اور مراٹھی زبان میں گیت ریکارڈ ہو گیا، جسے ان کی آواز میں فلموں کے لئے پہلا گیت گردانا جا سکتا ہے۔ شاید اس گیت کے بول اسطرح تھے، (ناچوں یا گرے کھیلوں ساری مانی حوص بھری) جو کہ میں صحیح طور پر نہ سمجھ پایا ہوں۔

یہ گانا بھی منظر عام پر نہ آسکا۔ ماسٹر وینائک نے اُمید کا دامن نہیں چھوڑا اور انہیں یہ اطمینان ہو گیا تھا کہ کم از کم خواتین کی گائیکی میں ایک سنگ میل کی بنیاد پڑ گئی تھی۔ دریں اثناء، وسنت جوگلیکر کو ایک ہندی فلم (1945ء) "آپ کی سیوا میں" کی ہدایتکاری کے فرائض سرانجام دینے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ اگرچہ اس فلم کی تکمیل میں دو برس لگ گئے لیکن لتا منگیشکر نے اپنے لئے جگہ بنالی جب ریکارڈنگ انجینئر نے ان کا گایا ہوا گیت "پا لاگوں کر جوڑی رے" "شیام موہ سے نہ کھیلو ہوری رے" کامیابی سے صوتی فیتے پر اتار لیا۔ اس اعتبار سے یہ گیت ہندی سینما کے لئے لتا کا پہلا منظر عام پہ آیا ہوا گیت ثابت ہوا۔

ماسٹر وینائک نے اپنی ان تھک کوششوں سے اس وقت کی بہت بڑی میوزیکل فلم "بڑی ماں" میں لتا کو موقع دلوانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس فلم کے موسیقار "دتا کورے گاؤنکر" تھے۔ اور نور جہاں کی یہ بہت بڑی اور کامیاب فلم تھی جس کے آخر میں لتا اور آشا کا نام بھی درج ہے۔ لتا کا گیت "ماتا تیرے چرنوں میں" نور جہاں کے نگینوں سے جڑے ہار کا ایک نگینہ تھا۔ میری رائے کے مطابق اگر پاکستان، دنیا کے نقشے پر ظہور پذیر نہ ہوتا (جو کہ برصغیر کے مسلمانوں کیلئے خدا تعالیٰ کا ایک تحفہ ہے) اور نور جہاں، بھارت ہی میں رہتیں تو لتا اور آشا کو وہ مقام نہ ملتا جسکو وہ آج چھ دہائیوں کے گزر جانے کے بعد حاصل کرنے میں کامیاب ہوئیں۔ بحرحال، لتا کے اس پہلے گیت کا کسی نے بھی ذکر نہیں کیا۔

ماسٹر وینائیک کا لتا منگیشکر کے ابتدائی ایام میں کردار:

1942-43ء میں ماسٹر وینائیک نے اپنے تیسرے اور آخری ادارے "پرافولہ پکچرز" کے زیر اہتمام چھ فلمیں بنانے کا اعلان کیا۔ ایک فلم کی ہدایتکاری کی ذمہ داری انہوں نے دی۔ شانتا رام کے ادارے "راج کمل کلا مندر" کے زیر اہتمام کی اور فلم 'ڈاکٹر کوٹنکس کی امر کہانی' میں اداکاری کرنے کا بھی اعلان کیا۔ اگرچہ ماسٹر وینائک نے 1943ء سے 1947ء تک سات فلمیں تخلیق کیں، لیکن لتا منگیشکر ان فلموں میں کسی بھی حوالہ سے شاذ و نادر نظر آئیں۔

تھی، میں نظر آئی۔ اسی فلم کی ایک اور غزل "یوں حسرتوں کے داغ محبت میں دھو لیے" ایک مسحور کن غزل تھی۔ لتا منگیشکر کی فلم "حقیقت" میں گائی گئی غزل "ذرا سی آہٹ ہوتی ہے تو دل یہ سوچتا ہے، کہیں یہ وہ تو نہیں" اور فلم "جہاں آرا" کی غزل "وہ چپ رہیں تو میرے دل کے داغ جلتے ہیں" اب بھی میری نفسیات میں رچے بسے ہیں۔ اس کے علاوہ لتا کے ایک بی کلاس فلم "ان پڑھ" کے لیے گائی ہوئی غزلیں "آپ کی نظروں نے سمجھا پیار کے قابل مجھے اور ہے اسی میں پیار کی آبرو، وہ جفا کریں، میں وفا کروں نے بھی دھوم مچادی تھی۔ یہ دونوں نغمے مالا سنہا پر فلمائے گئے تھے۔ اور اداکار دھرمیندر اُس وقت نو وارد تھے۔ لتا منگیشکر اور مدن موہن کی جوڑی ایک کامیاب جوڑی تھی۔ دونوں کے اشتراک سے جو غزلیں ظہور پذیر ہوئیں۔ وہ لازوال تھیں اور کوئی اور اشتراک، اتنی مٹھاس اور میلوڈی سے بھرپور وہ غزلوں کا معیار نہ قائم کر سکا جو لتا اور مدن موہن نے کیا۔ مدن موہن کی نفسیات پر اُس کے گھر میں نامور کلاسیکل اور غزل گائیکوں جیسا کہ اُستاد فیاض خان، اُستاد اکبر علی خان، ملکۂ موسیقی روشن آرا بیگم، بیگم اختر، سدھیشوری دیوی، طلعت محمود وغیرہ کی نشستوں نے، بہت گہرا اثر چھوڑا تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ لتا منگیشکر کی آواز میں فلم "دلہن ایک رات کی" کا نغمہ 'میں نے رنگ لی آج چنریا' اور 'پیاں نہ دھرو' جیسے آفاقی شاہکار تخلیق کر سکا۔ مدن موہن اور لتا کے اشتراک کا تذکرہ ادھورا لگے گا اگر ہم فلم "گیٹ وے آف انڈیا" کے دو عدد نغموں "دو گھڑی وہ جو پاس آ بیٹھے" (بمع محمد رفیع) اور "سپنے میں سجن سے دو باتیں، ایک یاد رہی اک بھول گئی" یاد کریں! اس پر یہ کہ یہ دونوں نغمے خوبصورت اداکارہ مدھو بالا پر فلمائے گئے تھے۔ اس دور سے تھوڑا آگے بڑھیں تو فلم "موسم" کی غزل "رُکے رُکے سے قدم رک کے بار بار چلے قرار دے کے تیرے در سے بیقرار چلے" (شرمیلا ٹیگور پر فلمائے گیا) اور چیتن آنند کی فلم، ہنستے زخم، کیلئے ماڈرن کلب میں ولن کے۔ این۔ سنگھ کے بھوکی نظروں سے بچتے ہوئے پریا راجونش پر جو کہ نون نشچل کی یادوں میں گم ہے، فلمائی گئی غزل "آج سوچا تو آنسو بھر آئے" لازوال تخلیقات ہیں۔ ستار کا مدھر استعمال لافانی ہے اسی فلم میں لتا نے ایک اور خوبصورت نغمہ "بیتاب دل کی تمنا یہی ہے" گایا ہے۔ نغمے کیفی اعظمی نے لکھے تھے۔ میں منوج کمار اور سادھنا کی فلم وہ کون تھی (1964) کی غزلیں کیسے بھول سکتا ہوں؟ اس فلم کی لافانی غزلیں "لگ جا گلے کہ پھر یہ ملاقات ہو نہ ہو، اور 'جو ہم نے داستان اپنی سنائی، آپ کیوں روئے؟' فنی، میلوڈی، گائیکی، کمپوزیشن اور فلم کی situation کے مطابق اعلیٰ معیار کی ضامن ہیں۔ آج بھی ان غزلوں کا ریفرنس دیا جاتا ہے۔

اسی طرح فلم 'میرا سایہ' جس میں سنیل دت اور سادھنا نے خوبصورت اداکاری کی تھی، کے گیت، تو جہاں جہاں بھی ہوگا، میرا سایہ ساتھ ہوگا' اور 'نینوں میں بدرا چھائے' بجری سی چمکی ہائے، لتا منگیشکر اور مدن موہن کی مُشترکہ کاوشوں کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ یہ 1966ء کی راج کھوسلہ کی ہدیتکاری میں ایک سپر ہٹ فلم تھی اور راج کھوسلہ کے ساتھ، سادھنا کی تیسری فلم: مندرجہ بالا دو فلموں کے علاوہ وہ 1963ء میں بنائے جانے والی فلم 'ایک مسافر ایک حسینہ' کی ٹیم کا حصہ تھے۔ مدن موہن کو اُسکے بنائے ہوئے گیت، نینوں میں بدرا چھائے، پر سُر سنگھار، ایوارڈ دیا گیا۔ فلم کا پلاٹ بھی تجسس پر مبنی تھا جس میں ٹھاکر رکیش سنگھ کی بیوہ گیتا، اُسکی کی ہمشکل رائنا کی شکل میں نمودار ہوتی ہے۔

لتا منگیشکر نے جب مدن موہن کے بیٹے سنجیو کوہلی کی لائبریری سے اُن کو بنائی گئی rejected دھنوں پر یاش چوپڑا کی فلم "ویر زارا" کے لیے گیت گائے، تو کہا کہ مدن موہن اور یاش چوپڑا دونوں کو وہ بھائی مانتی ہیں۔ اس لیے انہیں یہ گیت گاتے ہوئے احساس ہوا کہ وقت وہ ماضی کی خوبصورت موسیقی اور اُس وقت میں دوبارہ داخل ہوگئی ہیں۔ ان کے گائے ہوئے گیت تھے۔

☆تیرے لیے

☆ایسا دیس ہے میرا (ہمراہ اُدت نارائن، گرداس مان اور پرتھا موجمدار)

☆یہ ہم آ گئے ہیں کہاں (ہمراہ اُدت نارائن)

☆'دو پل' اور 'کیوں ہوا' (ہمراہ سونو نگم)

☆ہم تو بھائی جیسے ہیں (ہمراہ جگجیت سنگھ)

☆جانے کیوں

لتا منگیشکر کے مدن موہن کی موسیقی میں گائے ہوئے چند یادگار گیت ہیں

☆پریتم میری دنیا میں دو دن تو رہے ہوتے

☆سانوری صورت من بھائی رے پیا (فلم: ادا 1951ء شاعر: راجہ مہدی علی خان)

☆جا جا رے جا ساجنا کاہے سپنوں میں آئے، جا کہ دیس پرائے بیوفا

☆جانا تھا ہم سے دُور بہانے بنالیے۔

☆اُن کو یہ شکایت ہے کہ ہم کچھ نہیں کہتے (فلم: عدالت 1958ء، شاعر: راجندر کرشن ستارے: نرگس، پردیپ کمار)

☆وہ جو ملتے تھے کبھی ہم سے دیوانوں کیطرح آج یوں ملتے ہیں جیسے پہچان نہ تھی۔

(فلم: اکیلی مت جیئو 1963ء، شاعر: مجروح سلطان پوری ستارے: مینا کماری، راجندر کمار)

☆جیا جلے گجوا ری مورا سانورا
☆وہ دیکھو جلا گھر کسی کا
☆رنگ برنگی راکھی لے کر آئی بہناں
☆میں نہ جانوں میرے دل کو کیا ہو گیا
☆میرا اقرار لے جا مجھے بیقرار کر جا
☆دم بھر تو پیار کر جا
☆میرے پیا سے کوئی جا کے کہہ دے جیون کا سہارا تیری یاد ہے
☆مکھ موڑ نہ لینا سا جنا، دل رو رو کے بے چین
☆سماں ہے بہار کا لے مزا پیار کا
☆تم چاند کے ساتھ چل رہے ہو (فلم: آشیانہ 1952ء شاعر: مجروح سلطان پوری ستارے: نرگس، راج کپور)
☆بہاریں ہم ڈھونڈیں گی نہ جانے ہم کہاں ہوں گے۔ (فلم: باغی 1953 ستارے: نسیم بانو شاعر: مجروح سلطان پوری)
☆جا رے بدرا بیری جا رے جا رے (فلم: بہانہ، 1960ء شاعر: راجندر کرشن)
☆بیرن نیند نہ آئے (فلم: چاچا زندہ باد-1959ء، ستارے: کشور کمار، انیتا گوہا، شاعر، راجندر کرشن)
☆یہاں نہ دھڑ وہم ہیں متاع کوچہ و بازار کی طرح (فلم: دستک 1970ء، ستارے: ریحانہ سلطان، سنجیو کمار، شاعر: مجروح سلطان پوری)
☆مائی ری مائی، کا سے کہوں پیڑ اپنی جی
☆ڈولی چڑھ تے ہیرے نے بین کیئے (فلم: ہیر رانجھا، 1970ء ستارے: راج کمار، پریا راجونش)

مندرجہ بالا آخری گیت، اپنے انتروں میں تبدیلیوں کی وجہ سے بہت کامیاب گیت رہا، جس میں ہیر کی رانجھے سے جدائی کی پکار کو اجاگر کیا گیا تھا۔

فلم 'ایک کلی مسکائی' کے لئے لتا منگیشکر نے ایک اور خوبصورت مگر غمگین غزل گائی تھی، جس کے بول تھے 'نہ تم بے وفا ہو نہ ہم بے وفا ہیں، مگر کیا کریں اپنی راہیں جدا ہیں'، یہ نغمہ سن کر پتہ نہیں کیوں، میری آنکھوں میں نمی اُتر آتی ہے۔ شاید اس میلوڈی کی تاثیر ہی ایسی ہے! مدن موہن نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ اس نغمے کو کمپوز کرتے وقت انہوں نے اپنے اوپر وہ کیفیت طاری کی تھی کہ ایک محبوبہ کیا محسوس کرتی ہے، جب اس کا محبوب اس کو چھوڑ کر جا رہا ہو!۔

مجھے بہت مشکل محسوس ہوئی جب میں بینا رائے، پریم ناتھ کی فلم 'سمندر' کے دو عدد گیت تلاش کر رہا تھا۔ خاص طور سے اس 1957ء میں بننے والی فلم 'سمندر' کا گیت 'آ جا کہیں سے آ جا، دل کا قرار لے کر بیٹھی ہوئی ہوں کب سے تیرا انتظار لے کر' اور 'چین نہیں آئے، کہاں دل جائے' یہ دونوں نغمے بینا رائے نے سمندر کے کنارے پریم ناتھ کے انتظار میں فلمائے، جو کہ اس کاسٹیوم فلم میں، جنگ لڑنے گیا ہوا تھا۔ یہ گیت شاعر راجندر کرشن نے لکھے اور مدن موہن کی بنیادی میلوڈی اور آرکسٹرا کی آمیزش جادوئی ہے۔ مدن موہن کے ساتھ مسئلہ یہ رہا ہے کہ ان کی بہترین دُھنیں یا تو بی کلاس اداکاروں پر فلمائی گئیں، یا وہ فلمیں باکس آفس پر زیادہ کامیاب نہ ہو سکیں۔ لیکن ان کی وفات کے بعد گذشتہ کئی دہائیوں میں ان کے بنائے ہوئے گیتوں، خاص طور سے لتا منگیشکر کی آواز میں، کو بہت پذیرائی ملی ہے۔

لتا منگیشکر اور شنکر جے کشن:

1950ء کی دہائی میں لتا منگیشکر تقریباً تمام نمایاں موسیقاروں کے ساتھ مصروف رہیں۔ راج کپور کی فلم 'برسات' کی کہانی بھی بڑی دلچسپ ہے۔ میں نے اپنی کتاب 'میلوڈی میکرز' میں تذکرہ کیا ہے کہ ایک روز میں ہریش بھیمانی کی لتا منگیشکر پر لکھی گئی کتاب پڑھ رہا تھا کہ جب موسیقار نوشاد علی اپنی فلم ''انداز'' کے لئے لتا منگیشکر کا ایک نغمہ ریکارڈ کر رہے تھے۔ تو انہوں نے بمبئی فلم انڈسٹری کے نمایاں کارندوں کو اسٹوڈیو میں مدعو کیا ہوا تھا اور لتا منگیشکر کو ان نمائندوں کی آمد کا پتہ نہ چلنے دیا تا کہ لتا، جو کہ کم عمر تھیں، کہیں گھبرا نہ جائیں۔ ان قد آور شخصیات میں راج کپور بھی شامل تھے۔ اور ساتویں ٹیک (take) پر گانا فائنل ہو گیا۔

کچھ دنوں بعد ایک گورے رنگ کا نوجوان، جس کا نام شنکر تھا، لتا جی کے گھر گیا اور انہیں راج کپور کی آنے والی فلم 'برسات' کے تمام نغمے گانے کی دعوت دی۔ میں جب اوائل عمری میں تھا تو میں نے یہ فلم سینما ہال میں دیکھی اور فوراً ہی اس فلم کی موسیقی کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔ اس فلم میں ساتھ ساتھ دو جوڑوں کی کہانی بیان کی گئی تھی۔ ایک پہاڑن لڑکی نیلو (نمی) اور عیاش نوجوان شہری لڑکے گوپال (پریم ناتھ) اور ایک پہاڑن ریشماں (نرگس) کی شہری نوجوان پران (راج کپور) کی محبت کی داستان۔ فرق یہ تھا کہ پریم ناتھ کی نمی کے ساتھ محبت ایک دل لگی اور نرگس، راج کپور کی محبت حقیقی تھی۔ دوسرا جوڑا تو تمام رکاوٹوں کو عبور کر کے کامیاب ہو جاتا ہے۔ لیکن پہلے جوڑے میں جب پریم ناتھ کو نیلو کی دیانتداری کا احساس ہوتا تب تک نیلو اللہ کو پیاری ہو چکی ہوتی ہے۔ اور لتا کا گایا ہوا گیت، برسات میں ہم سے ملے تم، نیلو کی ارتھی اٹھنے اور سوگوار تاثر نمایاں کرنے میں معاون کردار ادا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ لتا کے گیت 'اب میرا کون سہارا' 'بچھڑے ہوئے پردیسی'، 'مجھے کسی سے پیار ہو گیا'، اس فلم کے خوبصورت گیت ہیں۔ اس آخر اللہ کر گیت میں نرگس، راج کپور کی وائلن پر بجائی

گئی دُھن، جسے وہ بھولپن میں 'باجا' کے نام سے پکارتی ہے۔ پر عاشق ہو جاتی ہے اور جب بھی یہ دُھن اس کے کان میں رس گھولتی ہے۔ وہ دوڑ کر راج کپور کی با نہوں میں آ گرتی ہے۔ اس کے علاوہ پریم ناتھ کا نا ئٹ کلب میں رقص پر گانا 'چلی کر ہے' اور نمی پر فلمایا گیا غمگین حصہ ایک خوبصورت دوگانہ ہے۔ اس کے علاوہ ایکسٹرا کردار پر مشہور نغمہ 'ہوا میں اڑتا جائے میرا لال دوپٹہ ململ کا' فلم کی ابتداء میں پہاڑی ماحول کو اجاگر کرتا ہے۔ اس فلم کی موسیقی موسیقار جوڑی شنکر جے کشن نے ترتیب دی تھی۔

لتا منگیشکر 1964ء میں فلم 'سنگم' کے گانے 'میں کا کروں رام مجھے بڈھا مل گیا' کی وجہ سے بہت عرصہ جے کشن اور راج کپور سے ناراض رہیں۔ یہ نغمہ لتا نے ان دونوں کے دباؤ میں آ کر ریکارڈ کیا تھا حالانکہ تاریخ گواہ ہے کہ یہ گانا اپنے وقت میں وجنتی مالا کی بے با ک اداکاری کی وجہ سے بہت کامیاب گیت تھا۔ لیکن لتا اپنے گلے شکوے بھلا کر، شنکر جے کشن کی آخری فلم تک، انکا ساتھ نبھاتی رہیں۔

1951ء کی ریلیز کی گئی فلموں میں شنکر جے کشن کی فلمیں 'بادل' 'کالی گھٹا' اور 'نگینہ' تھیں فلم 'بادل' کے لئے مجھے اب تک مدھوبالا کی چنچلتا، لتا کے گانے، ان سے پیار ہو گیا، فلمائے جانے پر یاد ہے۔ اسی طرح فلم 'نگینہ' کے لئے اداکارہ نوتن پر فلمایا گیا گیت، 'تو نے ہا ئے میرے زخم جگر کو چھو لیا' غم و اداسی کی بہترین عکا سی کرتا ہے۔ اس سے اگلے برس دلیپ کمار اور نمی کی فلم 'داغ' ایک انتہائی کامیاب فلم تھی۔ اس پکچر کا راگ بھیرویں میں کمپوز کیا گیا گیت 'اے میرے دل کہیں اور چل' خوشگوار تاثر میں طلعت محمود نے گایا اور غمگین لہجے میں لتا نے گایا۔ اور گلی گلی گایا جانے لگا۔ کوئی بھی استاد، اپنے نئے شاگردوں کی تعلیم، اس گیت کو یاد کروا کے کرتا ہے۔ 1952ء میں فلمیں 'پریت' اور 'پونم' ریکارڈ ہوئیں۔ لیکن لتا کے گیتوں 'راجہ کی آئے گی بارات' اور 'یہ شام کی تنہائیاں' 'ایسے میں تیرا غم' اس فلم نے راتوں رات کامیابی کی منزلیں طے کر لیں۔ 'آن' کیلئے نرگس کی اداکاری کی وجہ سے دھوم مچ گئی۔ اور پھر مکیش اور لتا کا دوگانہ 'آجا رے اب میرا دل پکارا' بھی مقبولیت کی حدوں کو چھو گیا۔

1953ء میں لتا نے شنکر جے کشن کے لئے فلموں 'آس' 'عورت' اور 'نیا گھر' کے لئے گیت گا ئے۔ اسی سال ہدایتکاری اُمیہ چکروتی نے اپنی فلم 'داغ' کی کامیابی کے بعد، اس فلم کی سائڈ ہیروئین اوشا کرن کو دیو آنند کے ساتھ لے کر فلم 'پتیا' بنائی۔ اگر چہ یہ فلم اتنی کامیاب نہ ہو سکی۔ جتنی کہ 'داغ' تھی۔ لیکن اس کے گانے، خاص طور سے لتا اور ہمیت کمار کا دوگا نہ 'یاد کیا دل نے کہاں ہو تم' اور لتا کا گیت 'کسی نے اپنا بنا کے مجھ کو مسکرانا سکھا دیا' مقبول ہوئے۔ اسی سال، دلیپ کمار اور نمی جیونت کی فلم میں لتا کا گایا ہوا نیم کلا سیکی گیت 'کارے بدرا جا رے جا' بہت پسند کیا گیا۔

خوبصورت موسیقی سے سجائی گئی فلم 'بسنت بہار' جس میں بھارت بھوشن کی آواز گروی رکھ دی گئی ہوتی ہے، لتا کا گیت 'میں پیا تیری تو مانے یا نہ مانے' اور دوگانہ 'نین ملے چین کہاں' 'دل ہے وہیں تو ہے جہا ں' (منا ڈے کے ساتھ) مقبول گیت تھے۔ پھر 1956ء میں شنکر جے کشن نے فلمیں 'چوری چوری' اور 'ہلاکو' میں ہٹ موسیقی دی۔ فلم 'ہلاکو' کے لئے لتا کا گیت 'دل کا نہ کرنا اعتبار کوئی' اور آشا کے ساتھ دوگانہ 'آجی چلے آؤ' قابل ذکر نغمے ہیں۔ فلم 'چوری چوری' جو کہ انگر یزی فلم 'رومن ہالیڈے' کا چربہ تھا کے دوگانے 'آجا صنم مدھر چاندنی میں ہم' اور 'یہ رات بھیگی بھیگی' 'یہ مست نظارے' (دونوں نغمے ہمراہ منا ڈے) بہت مقبول ہوئے۔ میری ناقص رائے میں لتا کی زندگی کا ایک بہترین نغمہ راگ بھوپالی میں بنایا گیا 'رسک بلما' تھا ایک اور نغمہ 'پنچھی بنوں اُڑتی پھروں مست گگن میں' ایک پنچھی کی پنجرے سے آزادی کی غمازی کرتا ہے۔ اس کے بعد لتا کا گایا فلم 'اناڑی' کا نغمہ 'تیرا جانا دل کے ارمانوں کا لٹ جانا' قابل تحسین ہے۔

میں ایک مرتبہ پھر اپنی کتاب 'میلوڈی میکرز' کا حوالہ دینا چاہوں گا۔ جس میں فلم 'دل اپنا اور پریت پرا ئی' کا ذکر کیا گیا تھا۔ اس فلم کے ستاروں میں راج کمار، مینا کماری، نادرہ، ٹن ٹن، ہیلن اور اوم پرکاش شامل تھے۔ لتا کے گیت 'عجیب داستاں ہے یہ، کہاں شروع کہاں ختم'، ایک خوبصورت گیت تھا۔ جس میں ہمجولیو ں نے کورس میں choir کا استعمال کیا تھا۔ یہ وہ سنگت ہے جو عموماً چرچوں میں عیسائی لوگ عبادت کیلئے استعمال کرتے ہیں۔ اس سنگت کا استعمال ان دنوں میں منفرد اور ندرت کا مقام رکھتا تھا۔

فلم 'جس دیش میں گنگا بہتی ہے' کے دو گیت 'او بسنتی پون پاگل' 'رو کو کوئی'۔ اور 'آ اب لوٹ چلیں' (ہمرا ہ مکیش) لتا کی ہوک پر مشتمل تھے اور آہ و پکار کے وا ویلے سے لبریز تھے۔ اداکارہ پدمنی کی اداکاری اور را ج کپور کی ہدایتکاری اپنے عروج پر تھی۔ فلم 'جنگلی' میں لتا کا گانا 'احسان ہوگا تیرا ہوگا مجھ پر' لتا اور محمد رفیع' دونو ں کی آوازوں میں علیحدہ علیحدہ گائے جانے کی وجہ سے بہت مقبول ہوا۔ اسی طرح فلم 'روپ کی رانی، چوروں کا راجہ' سے لتا اور طلعت کا دوگانہ 'تو روپ کی را نی میں چوروں کا راجہ' ایک جاذب گیت تھا۔

1962ء میں لتا کے گانے دو عدد فلموں میں بہت خوبصورت تھے۔ یہ فلمیں تھیں۔ 'دل ایک مندر' اور 'ہریالی اور راستہ'۔ فلم 'دل ایک مندر' میں مینا کماری کی جذباتی اداکاری، جب وہ اپنے شوہر راج کمار کی

زندگی کے لئے دعا گو ہے' جبکہ اگلے روز آپریشن ہے، گیت 'رک جا رات ٹھہر جا رے چندا' میں لاجواب ہے۔ اسی طرح لتا کا گیت 'ہم تیرے پیار میں سارا عالم کھو بیٹھے ہیں' بھی اسی طرح کے جذبات کا عکاس ہے۔ فلم 'ہریالی اور راستہ' کے ستارے منوج کمار اور مالا سنہا تھے اور اس کا گانا 'اللہ جانے' مولا جانے' لتا اور مکیش نے گایا تھا۔ ہدایتکار رشی کیش مکرجی کی فلم، 'اصلی نقلی' میں دیو آنند اور سادھنا کی اداکاری اور لتا کے گیت عروج پر تھے۔ اس فلم کا گانا 'تیرا میرا پیار امر' پھر بھی مجھے لگتا ہے ڈر' میرے پسندیدہ گانوں میں سے ایک ہے۔

1960ء کی دہائی شنکر جے کشن اور لتا کی ٹیم کے لئے ایک یادگار دہائی ہے۔ 1963ء کی فلم 'ایک دل سو افسانے' (انہی الفاظ پر مشتمل گیت) کے بعد 1964ء کی سائرہ بانو، راجندر کمار اور دھرمیندر کی فلم 'آئی ملن کی بیلا' تھی۔ اس میں لتا کا گیت 'تمہیں اور کیا دوں میں دل کے سوا' بہت مقبول ہوا۔ پھر فلم 'راج کمار' میں خوبصورت سادھنا پر فلمایا گیا گیت 'آجا آئی بہار دل ہے' دل لبھانے والا گیت تھا جس میں سادھنا ایک تالاب میں پھولوں کے درمیان نہاتے ہوئے گاتی ہے۔ اور شمی کپور اسے تالاب کے اندر سے سر نکال کر جھانکتا ہے۔ ہم نے مندرجہ بالا سطور میں 1964ء کی فلم 'سنگم' کا ذکر کیا ہے۔

فلم 'سنگم' ایک بڑی فلم تھی، جسکی عکاسی بھارت اور یورپ میں کی گئی تھی۔ ستاروں میں راج کپور، راجندر کمار اور وجنتی مالا کی تکون تھی۔ حسب معمول اس فلم میں راج کپور اور راجندر کمار گہرے دوست تھے۔ اور دونوں وجنتی مالا کی محبت میں گرفتار ہو گئے۔ راجندر کمار، اپنے دوست کی خاطر وجنتی مالا کو راج کپور سے بیاہ کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ پھر غلط فہمیاں اور بھارتی ناری کی اپنے شوہر سے وفاداری۔۔۔۔۔۔۔ یہ سب کچھ اپنے منطقی انجام تک پہنچتے ہیں۔ شنکر جے کشن اور لتا کی مشترکہ کاوشوں نے اس فلم کی کامیابی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ خاص طور سے لتا اور مکیش کا گایا ہوا سریلا نغمہ 'او میرے صنم، دو جسم مگر اک جان ہیں ہم'!

1965ء کا سال بھی لتا اور شنکر جے کشن کی جوڑی کے لئے نیا شگون لایا۔ ایک سحر انگیز میلوڈی' لتا کے گیت 'بے دردی بالما تجھ کو میرا من یاد کرتا ہے' فلم 'آرزو' میں نیا رنگ لے کر آئی' جسکو سادھنا نے بڑی خوبصورتی سے پکچرائز کیا۔ لیکن مجھے ذاتی طور پر نرگس کی فلم 'رات اور دن' جو کہ 1967ء میں بنی تھی، بہت پسند آئی۔ اس میں لتا کے گانوں نے مسحور کئے رکھا۔ جن میں 'رات دن دیا جلے، چپ نہ بیٹھو دل کی گرہ کھول دو' آوارہ اے میرے دل' جانے کہاں ہے میری منزل' وغیرہ شامل ہیں۔ ان گیتوں نے نرگس کے ڈبل رول، جس میں رات کو وہ ایک نائٹ کلب جانے والی عیاش خاتون بن جاتی ہے اور دن کے وقت ایک ستی ساوتری' بیوی' کے کرداروں کو جلا بخشی۔ دراصل لتا اور شنکر جے کشن کی مشترکہ، اختراعی صلاحیتوں پر درجنوں مثالیں مزید دی جا سکتی ہیں۔ مگر اس وقت میں لتا کی زندگی پر موسیقی کے اثرات پر چند گزارشات کروں گا۔

لتا کی زندگی اور موسیقی:

آج' جب کہ میں یہ چند سطور' لتا کی موسیقی کیلئے خدمات پر لکھ رہا ہوں، وہ پچاسی برس سے تجاوز کر چکی ہوں گی۔ انہوں نے پرانی اداکاراؤں، وحیدہ رحمان، مدھو بالا، نرگس، مینا کماری، نوتن اور سادھنا سے لے کر موجودہ نسل کی اداکاراؤں مثلاً پریتی زنٹا کے لئے گانے گائے ہیں۔ انہوں نے فلمی گیتوں کے علاوہ غزلیں، مذہبی گیت اور برصغیر میں بولی جانے والی تقریباً سب زبانوں میں گیت گائے ہیں اور ان کی بہت سی البم بھی منظر عام پر آ چکی ہیں۔ ہم اپنی گزارشات فقط اُن کے بمبئی فلم انڈسٹری میں گائے گیتوں تک محدود کر رہے ہیں۔

1991ء تک گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں سب سے زیادہ نغمے گانے والی شخصیت میں وہ اوّل نمبر پر تھیں۔ اور یہ کہا گیا تھا کہ انہوں نے تیس ہزار گانے گائے تھے۔ ان میں سولو نمبر، دوگانے اور کورس شامل تھے۔ جو انہوں نے 1948ء سے 1987ء تک گائے۔ اب تو ان گیتوں کی تعداد مزید بڑھ گئی ہو گی۔ اپنے والد دینا ناتھ منگیشکر کے علاوہ، لتا نے کئی اور گنی کلاکاروں سے موسیقی سیکھی۔ جب وہ بچی تھیں تو ظاہر ہے، کہ وہ کیا جانتی، اپنی زندگی کا تعین نہیں کر سکتی تھیں۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ وہ بہتر گلوکارہ بن سکیں گی یا اداکارہ۔

بہر حال روایتاً انہوں نے اداکاری میں چند فلموں میں کردار نبھانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکیں۔ ان کا آخری فلمی کردار 1950ء کی دہائی کے اوائل میں تھا۔ جیسا کہ بالائی سطور میں عرض کیا جا چکا ہے کہ 1942ء میں ماسٹر وینائک نے اپنی نو ئیگ چتر پٹ' فلم پہلی ماتا اگارگوز' میں اپنی آخری فلم بنائی تھی جس میں لتا نے اداکاری کی تھی۔ ریکارڈ کے مطابق، یہ ان کا پہلا فلمی کردار تھا۔ اگرچہ دادا چندے کر' نے اس فلم میں موسیقی دی تھی لیکن اس فلم میں لتا کا کوئی گیت شامل نہ تھا۔

کیو۔ لیو۔ رحمان اپنے ایک مقالے میں لکھتے ہیں کہ لتا منگیشکر نے موسیقی کی تعلیم کے لئے امن علی خان صاحب اور امانت خان صاحب سے بھی رجوع کیا تھا۔ لتا بچپن سے ہی خداداد صلاحیت سے مالا ما

ل تھیں اور ریاضت نے ان کی معاونت کی تھی۔ موسیقی کے نقاد کہتے ہیں کہ جب نور جہاں اور شمشاد بیگم عروج پر تھیں۔ اس دور میں ان کو بہت مرتبہ مایوسی کا سامنا کرنا پڑا کہ ان کی آواز بہت پتلی اور کان پھاڑ تھی۔ چونکہ ان کے والد کا انتقال جلدی ہو گیا تھا۔ اور گھر کو چلانے کیلئے سارا بوجھ لتا کے ناتواں کندھوں پہ پڑ گیا تھا، اس لئے لتا کو بہت جدوجہد کرنا پڑی۔ لتا کی موسیقی میں آمد کے وقت، صرف گیتا رائے اور شمشاد بیگم زندہ رہ سکیں کیونکہ قیام پاکستان کے بعد نور جہاں پاکستان منتقل ہو چکی تھیں۔ بہت مشکل سے، چند موسیقاروں، جیسا کہ ماسٹر غلام حیدر، انیل بسواس اور نوشاد علی کی مدد سے لتا کو نور جہاں کی چھاپ سے باہر نکالا گیا۔ تاریخ گواہ ہے کہ لتا کی بہن آشا کی بمبئی فلم انڈسٹری میں، 1950ء کی دہائی میں آمد پر دونوں بہنیں 1990ء کی دہائی تک راج کرتی رہیں۔

لتا جی کی آواز میں وسیع ہمہ گیری تھی اور موسیقار انکی آواز کے ساتھ کھل کر تجربات کر لیتے۔ میری ناقص رائے میں، لتا کی آواز میں پختگی اور صفائی 1970ء کی دہائی میں آئی۔ اس سے پیشتر ان کی آواز کم عمر بچی کی آواز معلوم ہوتی تھی، حالانکہ سریلا پن موجود تھا۔ 1980ء کی دہائی کے بعد انکی آواز میں کہیں کہیں ترشی کا شائبہ محسوس ہونے لگا تھا۔ لیکن پھر بھی سریلا پن برقرار تھا۔ لتا، ان خوش قسمت گلوکاروں میں سے ہیں۔ جن کو اپنے وقت کے مہان موسیقاروں نے بہترین دھنیں گوائیں۔

لتا اور نوشاد علی:

مندرجہ بالا تمہیدوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کس طرح نوشاد علی نے اپنی دھنوں کی وجہ سے لتا کی آواز کو جلا بخشی۔ کس طرح ان کی آواز میں ٹھہراؤ اور سکون پیدا کیا! یہ 1961ء کی بات ہے کہ میں اپنے دوستوں کو گورنمنٹ کالج، لاہور کی لاجیا گراؤنڈ میں فلم 'کوہ نور' کے دوگانے 'کوئی پیار کی دیکھے جادوگری' گلفام کو مل گئی سبز پری۔ اور 'دو ستاروں کا زمیں پر ہے ملن آج کی رات' ہمراہ مشتاق ہاشمی سنایا کرتا تھا۔ یہ دوگانے دلیپ کمار اور مینا کماری پر فلمائے گئے تھے۔ پھر 1949ء میں بنی فلم 'انداز' میں لتا نے گیت 'اٹھائے جا ان کے ستم' اور 'توڑ دیا دل میرا تو نے ارے بیوفا' گا کر ان گیتوں کو امر کر دیا۔ نرگس، راج کپور سے محبت کرتی ہے اور دلیپ کمار سمجھتا ہے کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے۔ دوگانہ 'ڈر نہ محبت کر لے' لتا ہمراہ شمشاد بیگم جب نرگس اور ککو پر فلمایا گیا تو دلیپ کمار کے تاثرات، پیانو بجاتے بہت عمدہ تھے۔ دراصل اس فلم میں دلیپ کمار کے چہرے کے تاثرات نے فلم بینوں کے دل موہ لئے تھے۔ وہ دن میلوڈی اور رومانس کے دن تھے۔ نوشاد علی ان چیدہ موسیقاروں میں سے تھے جنہوں نے لتا کو اپنی تمام فلموں میں گانے کے مواقع میسر کیے۔ حالانکہ لتا کی آمد سے پیشتر وہ اپنے گیت عموماً شمشاد بیگم اور زہرہ بائی سے لیتے تھے۔

بھارت کی پہلی رنگین فلم 'آن' میں دلیپ کمار اور نادرہ کی رومانوی جوڑی تھی۔ لیکن کردار نگاری پر اداکارہ نمی بھاری رہی۔ اس فلم کے لئے لتا کا گیت 'آج مورے من میں سکھی بانسری بجائے کوئی' ایک چنچل گیت تھا۔ لیکن ہدایتکار ایس۔ یو۔ سنی کی فلم 'بابل' جس میں رومانوی جوڑی منور سلطانہ اور دلیپ کمار کی تھی اور نرگس کا بڑا مضبوط کردار تھا۔ نے میرے دل پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ نرگس کے خوابوں کا شہزادہ دلیپ کمار تھا۔ اس فلم میں لتا کا گیت 'پنچھی بن میں پیا پیا گانے لگا' اور شمشاد اور طلعت محمود کا علیحدہ علیحدہ گایا ہوا گیت 'چھوڑ بابل کا گھر موہے پی کے نگر آج جانا پڑا' خوبصورت اور پر اثر نغمات تھے۔

1951ء میں فلمیں 'دیدار' اور سرلیش وٹنی جیونت کی فلم 'جادو' ریلیز ہوئیں۔ فلم 'دیدار' کے ستارے بہت قدآور تھے، یعنی کہ اشوک کمار، دلیپ کمار، نرگس، اور نمی۔ کہانی دو ایسے کم سن بچوں کی ہے جس میں لڑکی امیر زادی اور لڑکا غریب ہوتا ہے۔ حالات ایسے بنتے ہیں کہ وہ بچپن میں جدا ہو جاتے ہیں۔ ہدایتکار نتن بوس کی اس فلم میں کہانی کی مضبوطی، دلیپ کمار کے چہرے کے تاثرات اور کردار نگاری کی وجہ سے، اسے 'king of tragedy' کا خطاب ملا۔ (یعنی کہ 'المیہ نگاری کا بادشاہ')۔ بنیادی وجہ یہ تھی کہ بڑے ہو کر جب دلیپ کمار، نرگس سے ملتا ہے تو وہ اسے بھول چکی ہوتی ہے۔ لیکن دلیپ کمار نہیں۔ اس کے دل پر کیا گزرتی ہے، دلیپ کمار نے خوب عمدہ تاثرات دیئے۔ اس پلاٹ کی معاونت نوشاد علی اور لتا نے خوب کی۔ بچپن میں گایا گیا لتا اور شمشاد بیگم کا نغمہ 'ہو بچپن کے دن بھلا نہ دینا' اور لتا کے دو گیت 'دنیا نے تیری دنیا والے، سکھ چین ہمارا چھین لیا' اور 'لے جا میری دعائیں پردیس جانے والے' اس فلم کی موسیقی کی جان ہیں۔ لیکن میرا پسندیدہ نغمہ لتا اور محمد رفیع کا دوگانا 'دیکھ لیا میں نے قسمت کا تماشا دیکھ لیا' ہے۔ جس انترے کے climax میں گائیکی اور سازوں کی آمیزش دل کھینچ لیتی ہے۔ فلم 'جادو' میں لتا کے گیت 'لو پیار کی ہو گئی جیت' 'بلم ہم تیرے ہو گئے' اور 'الجھ گیا جیا مورے نینوں کے جال میں' مجھے اب تک یاد ہیں۔

مندرجہ بالا گیتوں اور دیگر نوشاد علی و لتا کے اتصالی ملاپ میں مشترکہ عنصر سریلا آہنگ تھا۔ نوشاد علی بھی ان چیدہ موسیقاروں میں سے ہیں۔ جنہوں نے کلاسیکی موسیقی کو بنیاد بنا کر بیشتر مقبول نغمے پیش کیے۔ پاکستان میں رشید عطرے اور خواجہ خورشید انور اس روایت کے علمبردار تھے۔ مجھے یاد ہے کہ جب فلم

بیجو باورا پردہ سیمیں پر نمودار ہوئی تو بھارتی فلمی موسیقی میں نمایاں فرق نظر آیا۔ ہدایت کار وجے بھٹ کی اس فلم کے تمام گانے راگوں کو بنیاد بنا کر تخلیق کیے گئے تھے۔ مشہور دوگانہ 'تو گنگا کی موج میں جمنا کا دھارا' راگ بھیروں میں بنایا گیا تھا لتا کا ایک اور نغمہ 'بچپن کی محبت کو دل سے نہ جدا کرنا' راگ مانڈ میں تخلیق کیا گیا تھا۔ اور میرے پسندیدہ نغموں میں سے ایک نغمہ 'مو سے بھول گئے سانوریا' راگ کا لنگڑا بھیروں میں تھا۔ لتا اور نوشاد علی کی بہترین فلم 'مغل اعظم' تھی اس فلم کے بارہ گیت شکیل بدایونی نے لکھے تھے یہ فلم ہدایتکار کے۔ آصف کی شاہکار پیشکش تھی۔ 1960ء کی مدھو بالا اور دلیپ کمار کی اس فلم نے کامیابی کے تمام ریکارڈ توڑ دیے اور اس فلم کی کامیابی کی ایک وجہ اس کی موسیقی تھی۔ لتا کے گائے ہوئے یہ گیت تھے۔

محبت کی جھوٹی کہانی پہ روئے

پیار کیا تو ڈرنا کیا

ہمیں کاش تم سے محبت نہ ہوتی (راگ ایمن کلیان)

اے عشق یہ سب دنیا والے......وغیرہ

لتا اور نوشاد علی کو جوڑی اس وقت کامیابی کے امتحان سے گزری جب انہوں نے پوربی زبان اور لہجے پر مبنی فلم 'گنگا جمنا' کے لئے 'ڈھونڈو ڈھونڈو رے ساجنا مورے کان کا بالا' (راگ پیلو) اور 'دو ہنسوں کا جوڑا بچھڑ گیو رے' جیسے مقبول نغمے تخلیق کیے 1962ء کی فلم سن آف انڈیا میں صرف ایک دوگانا 'دل توڑنے والے تجھے دل ڈھونڈ رہا ہے۔' قابل ذکر نغمہ ہے (لتا اور محمد رفیع) 1962ء کی مقبول عام فلم (میرے محبوب) جس میں ایچ۔ ایس۔ روئیل کی عمدہ ہدیتکاری نے جہاں اس مسلم سوشل فلم میں چار چاند لگا دیئے وہاں لتا کے نغموں نے سادھنا پر فلمائے گئے گیتوں کی وجہ اس فلم کی کامیابی میں اپنا حصہ ڈالا۔ اس فلم میں نو گانے تھے اور ستارے تھے۔ سادھنا راجندر کمار اشوک کمار پران نمی اور امیتا۔ سب سے خوبصورت اور تناسب والا گیت لتا کی آواز میں 'تیرے پیار میں دلدار جو ہے میرا حال زار ہے'۔ جو سادھنا کے رقص پر فلمایا گیا تھا۔ ایک اور دوگانہ، بمع آشا 'میرے محبوب میں کیا نہیں' قابل ذکر ہے، جو کہ سادھنا اور امیتا کے رقص پر فلمایا گیا تھا۔ ایک اور نغمہ دوگانے کی شکل میں 'جان من اک نظر دیکھ لے' آشا کے ساتھ بہت مدھر نغمہ ہے۔ سب سے خوبصورت گیت 'یاد میں تیری جاگ جاگ کے ہم' رات بھر کروٹیں بدلتے ہیں' لتا اور رفیع کی آواز میں راجندر کمار اور سادھنا پر پکچرائز کیا گیا تھا۔ ایک اور لتا اور رفیع کی آواز میں گایا گیا نغمہ 'میرے محبوب تجھے میری محبت کی قسم' اپنے زمانے کا گھر گھر گایا جانے والا گیت تھا۔ راگ جھنجوٹی میں بنائے گئے اس گیت کو تھوڑی بہت رد و بدل کے بعد ایم۔ ایس۔ بابوراج نے ایک ملایالم فلم میں پیش کیا۔

1964ء کی لتا اور نوشاد علی کی دلیپ کمار اور وجنتی مالا کی ایک اور کامیاب فلم 'لیڈر' تھی۔ لتا جی کا گانا 'آج ہے پیار کا فیصلہ' کے علاوہ، ان کا محمد رفیع کے ساتھ ایک دوگانہ 'اک شہنشاہ نے بنوا کے حسیں تاج محل' سارا گ للعت پر مبنی سریلا نغمہ تھا۔ جسے تاج محل۔ آگرہ میں فلمایا گیا تھا۔ ایک دوگانہ 'تیرے حسن کی کیا تعریف کروں' قابل ذکر ہے۔

دلیپ کمار۔ وحیدہ رحمان۔ پران۔ رحمان اور شیاما کی فلم 'دل دیا درد لیا' یورپین ناول 'وودرنگ ہائیٹس' (لکھاری: شارلٹ برونٹے) پر مبنی فلم تھی۔ مجھے انتہائی افسوس ہوا جب کہ یہ خوبصورت فلم تجارتی نقطہ نظر سے کامیابی حاصل نہ کر سکی۔ حالانکہ یہ جمالیاتی طور پر ایک عمدہ فلم تھی۔ اگر چہ اس فلم کا سب سے خوبصورت نغمہ 'کوئی شاعر دل کو بہلاتا نہیں' سب سے عمدہ گیت تھا۔ (راگ جھنجھوٹی) مگر لتا کا گایا ہوا گیت 'پھر تیری کہانی یاد آئی' 'پھر تیرا افسانہ یاد آیا' کچھ کم نہ تھا۔ نغمہ 'کیا رنگ محفل ہے دلدارم' 'اے جان عالم' بھی اپنی طرز کا ایک خوبصورت نغمہ تھا۔ اگلی فلم 'ساز و آواز' تھی۔ لیکن لتا کے گانے 'دلہن بن کے آئی' کے باوجود اسکی موسیقی کوئی تاثر نہ چھوڑ سکی۔ مسلم سوشل فلم 'پالکی' میں راجندر کمار اور وحیدہ رحمان جلوہ گر ہوئے۔ یہ ایس۔ یو۔ سنی کی پروڈکشن تھی۔ لتا کا گایا گیت 'جانے والے تیرا خدا حافظ' بہت غمگین اور پر اثر گیت تھا۔

نوشاد علی کی فلم 'رام اور شیام' نے کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ اس فلم میں دلیپ کمار کا ڈبل رول تھا۔ لتا کا گیت 'میں ہوں ساقی' 'تو ہے شرابی شرابی' (محمد رفیع کے ساتھ) نے مقبولیت کے ریکارڈ توڑ دیئے حالانکہ لتا کا سولو گانا 'میں نے کب تم سے کہا تھا مجھے پیار کرو' 'پیار جب تم نے کیا تھا تو نبھایا ہوتا' ایک سحر انگیز نغمہ تھا۔ اس نغمہ کی استھائی اونچے سروں سے شروع ہو کر، آہستہ آہستہ نچلے سروں کو جب چھوتی ہے تو روایت کو توڑتے ہوئے، بھلی محسوس ہوتی ہے۔

میں نے 1968ء میں بننے والی فلم 'ساتھی' جس کے نمایاں وجنتی مالا، راجندر کمار اور سی گریوال تھے۔ اپنی اعلیٰ تعلیم کی وجہ سے برمنگھم میں موزلے روڈ پر واقع امپیریل سینما میں دیکھی تھی۔ اس فلم میں راجندر کمار تو اپنی سائنسی تحقیق کی وجہ سے اپنی بیگم وجنتی مالا کے لئے وقت نہیں ہوتا، جو کہ خاموشی سے یہ جدائی برداشت کرتی رہتی ہے، اور بیمار پڑ جاتی ہے۔ اتنے سنجیدہ موضوع پر بننے والی فلم کے موضوع کو بھارتی فلم بین ہضم نہ کر سکے۔ لتا کے گائے ہوئے گیت 'یہ کون آیا روشن ہو گئی محفل جس کے نام سے' 'میں تو پیار سے تیرے' اور 'میرے جیون ساتھی' خوبصورت تھے۔ فلم 'انداز'

کے بعد کئی برسوں بعد نوشاد علی نے مکیش کو لے کر ایک خوبصورت نغمہ 'حسن جاناں ادھر آ' آئینہ ہوں میں تیرا' تخلیق کیا۔

1968ء میں فلم 'آدمی' منظر عام پر آئی۔ دلیپ کمار کی مضبوط، جذباتی کردار نگاری کے باوجود یہ فلم تجارتی نقطہ نظر سے کامیاب نہ ہوئی۔ لتا کے خوبصورت گیت، وحیدہ رحمان پر فلمائے گئے تھے۔ جو کہ منوج کمار کی محبت میں گرفتار ہے، یہ گیت تھے 'کاری بدریا' اور 'کل کے سپنے آج بھی آنا'۔ اسی سال دلیپ کمار اور وجنتی مالا کی فلم 'سنگھرش' کی نمائش ہوئی۔ یہ فلم بھی خوبصورت موسیقی اور طاقت ور پلاٹ کے باوجود، اتنی کامیابی نہ حاصل کر سکی، جتنی کہ اس سے توقع تھی۔ ایچ۔ ایس۔ رویل کی اس فلم میں بلراج ساہنی بھی ایک نمایاں کردار میں نظر آئے۔

لتا کے تین گیت تھے۔

☆ چھیڑو نہ دل کی بات

☆ میرے پاس آؤ نظر تو ملاؤ (قوالی انگ)

☆ اگر یہ حسن میرا

فلم محبوب، کی کامیابی کے بعد ایچ۔ ایس۔ رویل یہ فلم سادھنا کے ساتھ بنانا چاہتے تھے لیکن thyroid کی بیماری ہو گئی تھی اور وہ بوسٹن، امریکہ میں علاج کی غرض سے چلی گئی تھی۔

1957ء کی فلم میں دلیپ کمار اور وجنتی مالا کی جوڑی، فلم بینوں میں بہت مقبول ہوئی تھی اور یہ بھی خبر گرم رہی کہ دونوں کا رومان عروج پہ تھا۔ لیکن دونوں کے درمیان خلیج اُس وقت بڑھی جب 1964ء میں وجنتی مالا نے راج کپور کی فلم 'سنگم' سائن کی۔ دونوں کے تعلقات میں بہتری نہیں آئی اور یہ بھی سننے میں آیا کہ 'سنگھرش' کے کئی مناظر جن میں دونوں کو اکٹھے دکھایا جاتا تھا۔ علیحدہ علیحدہ فریموں میں ریکارڈ کیے گئے۔ جب فلم کی شوٹنگ اختتامی مراحل سے گزر رہی تھی تو دونوں کے تعلقات اتنے کشیدہ ہو گئے کہ وجنتی مالا کی جگہ وحیدہ رحمان کو سائن کرنے کا سوچا جانے لگا۔ اس سے پہلے بھی 1967ء کی فلم 'رام اور شیام' میں وحیدہ رحمان نے وجنتی مالا کی جگہ لی تھی۔ اتفاقاً دونوں فلموں کی شوٹنگ برابر چل رہی تھی۔ وجنتی مالا نے 'سنگھرش' کا کنٹریکٹ مکمل کرنے کی ٹھانی اور یہ دلیپ اور وجنتی کی آخری فلم ٹھہری۔ اس سے پہلے اس جوڑے کی تمام فلمیں کمرشل لحاظ سے بہت کامیاب فلمیں تھیں۔

نوشاد صاحب نے 1970ء میں نریش کمار کی فلم 'گنوار' اور 1972ء میں فلم 'پاکیزہ' میں موسیقی دی۔ فلم 'گنوار' میں لتا کا کوئی گیت نہ تھا۔ فلم 'پاکیزہ' کو مکمل کرنے میں بہت وقت لگا کیونکہ اس فلم کی ہیروئن کے تعلقات اپنے خاوند کمال امروہوی سے بہت سال کشیدہ رہے۔ کمال امروہوی کی اس خوبصورت فلم کو مکمل کرنے میں نرگس اور سنیل دت نے اپنا کردار نبھایا اور مینا کماری کو بقیہ ماندہ شوٹنگ مکمل کرنے کے لئے راضی کر لیا۔ موسیقار غلام محمد نے اس فلم کے گانے ریکارڈ کر لیے تھے۔ اب مسئلہ بیک گراؤنڈ موسیقی کی ریکارڈنگ مکمل کرنے کا تھا۔ موسیقار خیام نے مجھے بتایا تھا کہ شروع میں، کمال امروہوی صاحب نے انہیں یہ کام مکمل کرنے کو کہا لیکن دیانت داری کا یہ تقاضا تھا کہ موسیقار نوشاد علی یہ کام نبھائیں کیونکہ تمام عمر غلام محمد، ان کے معاون رہے تھے۔ چنانچہ نوشاد صاحب نے نہ صرف اس فلم کا بیک گراؤنڈ میوزک دیا بلکہ لتا کی آواز میں خوبصورت آلاپ بھی ریکارڈ کیا، جسے فلم میں ایک سے زائد مرتبہ استعمال کیا گیا۔

اس کے بعد نوشاد علی نے فلم 'تانگے والا' میں لتا سے گیت 'جوانی بار بار نہیں آئی' اور 'اے رے کھلونے والی آئی' ریکارڈ کروائے۔ لیکن اس کے بعد فلموں 'مائی فرینڈ' ۔ 1974ء 'سنہرا سنسار۔ 1975ء '' آئینہ۔ 1977ء'' چنبل کی رانی۔ 1979ء' دھرم کانٹا۔ 1982ء'' پان کھائے سیاں ہمار۔ 1985ء' اور 'لو اینڈ گاڈ۔ 1986ء' میں کوئی بھی لتا کا قابل ذکر گیت نہ تھا۔ یہ آخری فلم ہدایتکار کے۔ آصف کے انتقال کیوجہ سے نامکمل رہ گئی تھی اور اس فلم کے ہیرو سنجیو کمار کی کوششوں سے تدوین کے بعد، اس فلم کو، جہاں تک یہ بنی تھی، ریلیز کر دیا گیا۔

لتا اور سلیل چودھری:

آپ کو مشرقی دھن اور مغربی اثر پہ بنائی گئی دھن کا موازنہ کرنا ہو تو لتا منگیشکر کے دو گانے سن لیں۔ پہلا 'ہو سجا بر کھا بہار آئی' (فلم پرکھ) اور دوسرا، 'آج کوئی نہیں اپنا، کسے غم یہ سنائیں'۔ (فلم اگنی پرکھشا 1981ء) پہلے گیت میں دونوں انتروں کی مختلف دھنیں اور طبلہ کا چلن خصوصی توجہ کا طالب ہے۔ دوسرے گیت میں سلیل چودھری کے والد کی لائبریری میں مغربی موسیقی کے خزانے کی موجودگی، کا اثر شامل ہے۔ سلیل بچپن ہی سے Bach, Mozart, Chopin کی سمفنیاں سن کر جوان ہوا تھا اور کلاسیکی مغربی موسیقی کا، اس پر اثر ایک قدرتی امر تھا۔ اس لیے اس نغمہ کے Interlude وغیرہ مغربی طرز کے ہیں۔ استھائی اونچے سُروں سے شروع ہو کر نچلے سُروں کو چھوتی ہے۔ لتا منگیشکر نے یہ دونوں گیت خوبصورتی سے نبھائے۔ اس فلم کو مشہور فلمساز بی۔ آر۔ چوپڑا نے اسول پالکر، پرکھشت ساہنی اور راشٹوری کو لے کر بنایا تھا۔ لتا نے اس فلم میں ایک اور گیت، 'او میرے گن گن' گایا تھا۔

اسی انداز میں، فلم 'چھایا' کا دوگانہ 'اتنا نہ مجھ سے تو پیار بڑھا' قابلِ ذکر ہے جسے لتا اور طلعت محمود نے بخوبی نبھایا۔ یہ گیت Mozart کی ایک مشہور سمفنی سے مستعار لیا گیا تھا۔ لتا کا ایک اور گیت، فلم 'آنند' سے، ایک خوبصورت میلوڈی ہے جس میں نچلے سُروں سے اونچے سُروں میں گیت 'نہ جیا لاگے نہ، تیرے بنا سانوری کا جیالا گے نہ' مکھڑا تجویز کیا گیا ہے۔ جس ایک مدھر تاثر پیدا کیا گیا ہے فلم 'آنند' راجیش کھنہ جو کہ کسی مہلک بیماری میں مبتلا ہے، کی خوبصورت اداکاری اور امیتابھ بچن کے معاون کردار کی وجہ سے یادگار فلم ہے۔

1950ء کی دہائی میں فلموں میں ایک عدد لوری شامل کرنے کا رواج تھا۔ جب سلیل چودھری 1953ء میں اپنی کہانی 'رکشہ والا' کو سیلولائیڈ پر منتقل کرنے کی غرض سے بمبئی پہنچا تو اس نے بلراج ساہنی۔ نروپا رائے کی فلم 'دو بیگھہ زمین' کے لیے ایک بے مثال لوری لتا کی آواز میں 'آ جاری آ نندیا تو آ' کمپوز کی۔ یہ لوری ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ راج کپور اور نرگس کی فلم 'جاگتے رہو' کیلئے لتا نے سلیل چودھری کی موسیقی میں 'جاگو موہن پیارے' جیسا بھجن گا کر اس فلم کو چار چاند لگا دیے۔

1960ء کی فلم 'اُس نے کہا تھا' میں لتا اور طلعت کا ایک خوبصورت دوگانا 'آہا رم جھم کے یہ پیارے پیارے گیت لیے' میں آج بھی گنگناتا ہوں۔ اس گیت میں جھینگر بولے چکی میکی' کو اس طرح کمپوز کیا گیا ہے کہ واقعتاً کانوں میں جھینگر کے بولنے کی آواز رس گھولتی ہے۔ چھایا (1961ء) کے دو گیتوں کے ساتھ ملا کر اس تیسرے گیت نے، میرے دوستوں کو میری آواز میں یہ مثلث اچھی لگتی تھی۔ سلیل چودھری کا بچپن آسام کے چائے کے باغات میں گزرا تھا۔ جہاں اس کے والد ڈاکٹر تھے۔ شاید اسی لیے اُن کے بنائے ہوئے گانوں میں جنگل کا پُر اسرار ماحول پایا جاتا تھا۔ آج جب میں لتا کا گانا 'آ جا رے پردیسی' یا 'جھلمی سنگ آنکھ لڑی' سنتا ہوں (فلم مدھومتی۔ 1958ء) تو میرے اس تاثر کو تقویت ملتی ہے۔ اب چاہے فلم 'مایا' کا گانا 'جا رے، جا رے اڑ جاوے پنچھی'، ہو یا میرا پسندیدہ نغمہ 'تصویر تیری دل میں جس دن سے اُتاری' ہے، (رفیع۔ لتا) ہو یا مدھومتی، کے دیگر نغمے 'گھڑی گھڑی' میرا دل دھڑکے'، ہو یا 'دیا رے دیا رے چڑھ گئیو پاپی بچھوا'، ہو ان گیتوں میں پُراسراریت، بنگال اور آسام کا لوک رنگ اور بانسری و سیکسوفون کا ملاپ نمایاں نظر آتا ہے۔'

سلیل چودھری نے 1968ء کی فلم 'انوکھی رات' کی بیک گراؤنڈ موسیقی بھی ترتیب دی جبکہ اس کے گانے موسیقار روشن نے اپنے انتقال سے پہلے ریکارڈ کروا دیے تھے۔ لتا کا گانا 'محلوں راجہ ملا' نرگس کی بھتیجی زاہدہ پر فلمایا گیا تھا جو کہ آج بھی کانوں میں رس گھولتا ہے اور میلوڈی دور کے ساتھ تجدید وفا کرتا ہے۔

ایس۔ڈی۔برمن اور لتا:

ہر کن رس کی اپنی اپنی پسند بھی ہوتی ہے۔ اگر لتا اور ایس ڈی کا کوئی ایک گانا پسند ہے تو دوسرے ذی شعور کن رس شخص کو کوئی اور پسند ہو سکتا ہے۔ اس ضمن میں لتا کے گائے ہوئے 1970ء کی فلم 'عشق پر زور نہیں' کا گانا، 'تم مجھ سے دُور چلے جانا نہ' کا بھی ذکر کروں گا۔ (ستارے: دھرمیندر، سادھنا، بسواجیت) اور 1971 میں بننے والی فلم 'تیرے میرے سپنے' کے دوگانے 'جیون کی بگیا مہکے گی' (مع کشور کمار) کا بھی۔ اگر پہلا گیت کا حق سادھنا نے نبھایا تو دوسرے کا ممتاز اور دیو آنند نے اس فلم کے دیگر ستاروں میں وجے آنند اور ہیما مالنی شامل تھے۔ یہ فلم اے۔ جے۔ کرونن کے ناول سٹاڈل 'Citadel' (شہر کی بالائی سطح پر قلعہ) پر مبنی تھی۔ دیو آنند ایک ایسا ڈاکٹر ہے جو اپنے نیک آدرش لئے، گاؤں میں جا کر غریبوں کا علاج کرتا ہے۔ وہاں ایک نرس نشا (ممتاز) سے محبت کرتا ہے اور پھر بیاہ! گاؤں میں وہ دوسرے ڈاکٹروں، ڈاکٹر پرساد (مہیش کول)، دندان ساز ڈاکٹر بھوٹانی (آغا) وغیرہ۔ ناخوش ڈاکٹر پرساد کے کلینک پر اس کی بیوی سے جھڑپ کے بعد، وہ نشا کو شہر بھیج دیتا ہے اور بہت عرصہ اس کا حال بھی نہیں پوچھتا (مصروفیت کے باعث)، اُس کو یہ بھی معلوم ہوتا کہ اُسکی بیوی حاملہ ہے۔ دریں اثناء آنند کمار ایک اداکارہ مالا کا ذاتی معالج بھی بن جاتا ہے۔ نشا اپنے خاوند کے بے رخی کے باعث علیحدگی اختیار کر لیتی ہے۔

لتا اور ایس ڈی ٹیم کا مجھے فلم 'شرمیلی' کا ایک اور سُریلا نغمہ 'میگھا چھائے آدھی رات' بیرن بن گئی نندیا، بہت مدھر لگتا ہے۔ یہ سبھودھ مکھرجی کی فلم تھی جسکی ہدایتکاری سمیر گنگولی کے سپرد تھی۔ اس فلم کے ستارے ششی کپور، راکھی، نریندر ناتھ، ناصر حسین، افتخار، انیتا گوہا اور اسیت سین تھے۔ شرمیلی کے تمام گانے ہٹ گانے ثابت ہوئے اس کے علاوہ ایس۔ ڈی اور لتا نے دیگر فلموں کیلئے بھی باکمال گیت تخلیق کیے۔ فلم 'جیول تھیف' کیلئے وجنتی مالا کا لتا کے گیت 'ہونٹوں پہ ایسی بات میں دبا کے چلی آئی' پر دلفریب رقص اور لتا کا جدائی کے لمحات پر گایا گیت 'رُلا کے گیا سپنا میرا' میری نفسیات پر ابھی بھی چھائے ہوئے ہیں۔ پھر چنچل دوگانہ (لتا۔ رفیع) 'دل پکارے آرے آرے'، ہم کیسے بھول سکتے ہیں! اس دوگانے میں ستار اور بانسری ملکر خانہ بدوشوں کا ماحول پیدا کرتے ہیں۔ دیو آنند کی فلم 'گائیڈ' میں ایس۔ ڈی۔ برمن اور لتا کی جوڑی کا ایک نیا رنگ دیکھنے کو ملا۔ سب سے پہلے تو تذکرہ اُس گانے یعنی کہ 'پیا توسے نیناں لاگے' کا کرنا چاہوں گا جس میں لتا کی گائیکی ایس۔ ڈی۔ کا مختلف تالوں (ٹھیکوں) پر مبنی گیت کی تخلیق اور وحیدہ رحمان

کا خوبصورت رقص، اپنے عروج پر تھا۔ اس گانے میں وحیدہ رحمان کے ایک گاؤں میں ناچنے والی رقاصہ سے ایک بلند قامت اسٹیج کی رقاصہ تک کا سفر کامیابی سے طے کرتے دکھایا گیا ہے۔ اس نغمے میں لتا کی ادائیگی بھی عروج پر ہے۔ میں نے طبلے کے خوبصورت استعمال پر آرسٹرے کے مدھر استعمال بہت کم دیکھا ہے۔ ایک اور خوبصورت نغمہ جبکہ وحیدہ اسٹیج کی کامیاب ایکٹرس بن چکی ہوتی ہے۔ لتا کی آواز میں ہے 'موہے چھل کیو جائے، ہائے رے ہائے' دیکھوسیاں بے ایمان'۔ 1965ء کی فلم گائیڈ اپنی اچھوتی کہانی کی وجہ سے ایک انتہائی کامیاب فلم تھی۔

اس فلم میں وحیدہ رحمان نے ایک باغی، دل موہ لینے والی خوبصورت کردار، روزی کو انتہائی خوبصورتی سے نبھایا ہے، جو کہ اپنے خاوند کے ظلم وستم سے آزادی حاصل کر کے، گائیڈ دیو آنند کی معاونت کے ساتھ اپنے فن کو جلا بخشتی ہے۔ وحیدہ رحمان نے اپنی آزادی کے سعد کو انتہائی بے باک انداز میں اداکاری کر کے، لتا کے گیت، آج پھر جینے کی تمنا ہے، پر بڑی مہارت سے فلمایا۔ اس فلم میں راجو گائیڈ کا کردار دیو آنند نے خوبصورتی سے نبھایا ہے جو راجستھان میں سیاحوں کی رہنمائی کرتا ہے اور اسی پس منظر میں روزی کو اپنے عیاش خاوند کے چنگل سے آزادی دلاتا ہے۔ اس فلم کے آخری حصے میں، جس کا پلاٹ محبت دھوکے اور پشیمانی پر مشتمل ہے، راجو گائیڈ ایک روحانی رہنما کا روپ دھار لیتا ہے اور گاؤں کو خشک سالی کی تباہ کاریوں بچالیتا ہے! یہ بہت اچھوتی کہانی تھی، جس کی کامیابی میں ایس۔ ڈی۔ کی موسیقی میں لتا کے گائے ہوئے گانوں کا بہت عمل دخل ہے۔

ذرا ماضی کیطرف مزید سفر کریں تو مجھے یاد ہے کہ میں نے اپنے بچپن میں 1951ء میں بننے والی فلم 'سزا' دیکھی تھی۔ اس فلم کے ستاروں میں دیو آنند، نمی کے علاوہ کے۔ این۔ سنگھ، للتا پوار، شیاما گوپ، بکری اور دزرگار کھوٹے، شامل تھے۔ لتا منگیشکر کا گانا 'تم نہ جانے کس جہاں میں کھو گئے، درد اور سوز سے بھرپور نغمہ تھا۔ اس کے علاوہ طلعت محمود اور لتا منگیشکر کا دوگانہ 'آجا آجا تیرا انتظار ہے'۔ ایک مدھر رومانوی گیت تھا۔ میں نے موسیقاروں پر تحقیق پر اپنی کتاب 'میلوڈی میکرز' میں بھی تذکرہ کیا ہے کہ 1954ء میں، جب میں نے اپنے خاندان کے دیگر ممبران کے ساتھ 'ٹیکسی ڈرائیور' دیکھی تو اس کے گانوں نے مجھ پر بہت گہرا اثر کیا۔ خاص طور پر سے طلعت محمود اور لتا منگیشکر کے علیحدہ علیحدہ گیت 'جائیں تو جائیں کہاں، سمجھے گا کون یہاں درد بھرے دل کی زبان' نے، معاون اداکارہ شیلا رامانی کے رقص پر جھولتے ہوئے جسم اور قدموں کی حرکات پر کلب سانگ 'دل سے ملا کے دل پیار کیجیے' نے بہت سحر کن تاثر چھوڑا۔ اس نغمہ کی شاعری ساحر لدھیانوی کی تھی۔ یہ وہی شیلا رامانی ہیں جنہوں نے پاکستان آکر فلم انوکھی میں مرکزی کردار نبھایا تھا۔ ایس ڈی برمن نے اس فلم کی موسیقی پر فلم فیئر ایوارڈ حاصل کیا۔

ایس۔ ڈی۔ اور لتا کی ٹیم نے مہیش کول کی فلم، نوجوان، کے لئے نلنی، جیونت پر فلمایا گیا گیت، ٹھنڈی ہوائیں لہرا کے آئیں، تخلیق کیا تھا اس فلم کے ہیرو پریم ناتھ تھے۔ اس فلم کی کہانی اس باغی حسینہ کے کردار پر مبنی ہے جو اپنی پسند کے شوہر کی متلاشی ہوتی ہے اور ایک شخص، اُس کی پسند بن کر اُسکی زندگی میں داخل ہوتا ہے۔

اسی دور کی فلم 'بزدل' بھی موسیقی کے اعتبار سے ایس۔ ڈی۔ لتا اشتراک کی ایک پسندیدہ فلم ہے۔ لتا کا گیت، روتے روتے گزر گئی رات رے، ایک پرسوز گیت ہے۔ اس فلم کے گانے کیفی اعظمی اور شیلندر نے لکھے۔ اس گانے کی خوبصورتی، اس کی سادگی اور اس میں چھپا درد ہے۔ اس کے علاوہ اس فلم کا نیم کلاسیکی گیت، جھن جھن جھن پائل باجے، تین تال لے میں ایک دلکش کلاسیکل رقص پر مبنی گیت ہے۔ میرے لیے یہ گیت اس لیے بھی ایک یادگار گیت ہے کہ اسے میری خالہ ذکیہ دل محمد جو کہ پنجاب یونیورسٹی کے فائن آرٹس ڈیپارٹمنٹ میں پروفیسر بھی تھیں، اپنی سُریلی آواز میں گھریلو محفلوں میں گایا کرتی تھیں۔ ایک طفل مکتب کی حیثیت سے میں، ان کو کاپی کیا کرتا تھا جس سے مجھے گلوکاری کیطرف رغبت ہوئی۔

فلم 'ٹیکسی ڈرائیور' کا دوبارہ ذکر کرنا، اس لیے بھی لازم ہے کہ اس فلم کے لتا کے گائے ہوئے نغمے 'اے میری زندگی' اور 'دل جلے تو جلے' خوبصورت کلب گیت تھے۔ اس کے علاوہ فلم 'گھر نمبر 44' میں لتا کا خوبصورت نغمہ 'پھیلی ہوئی ہیں سپنوں کی بانہیں' اداکارہ کلپنا کارتک پر فلمایا گیا تھا۔ اس فلم کی شوٹنگ کے دوران اُس کا دیو آنند سے رومان ہوا اور دونوں حقیقی زندگی میں شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔

بمل رائے کی فلم، دیوداس، دلیپ کمار کی یادگار فلم تھی، جس میں چترا سین اور وجنتی مالا نے خوبصورت کردار نبھائے۔ یہ فلم شرد چندر چٹوپادھیائے کے ناول پر مبنی تھی۔ لتا کے گائے ہوئے گیتوں، 'جسے تو قبول کرلے' اور 'اب آگے تیری مرضی' اور 'او جانے والے رُک جا' اس فلم کے خوبصورت گیت ہیں۔

راجو بھرتن نے لتا کی سوانح میں لکھا ہے کہ چھ برس تک ایس۔ ڈی نے لتا سے گانے نہ لیے اور ان کی بہن آشا سے گیت لیتا رہا جسے وہ او۔ پی کے اثر سے باہر نکال کر لایا۔ لیکن جونہی ایس۔ ڈی اور لتا میں صلح ہوئی، آشا دوسری ترجیح کے درجہ پر منتقل کردی گئی۔ "لتا ہمیشہ اولین ترجیح رہی" دادا نے مجھے کہا۔ "آشا میری دوسری ترجیح تھی" جب لتا سے اس معاملہ میں استفسار کیا گیا تو وہ بولیں دادا مجھے ایک گیت کرو جیسی آواز میں گانے کو کہا۔ میں حکم بجالائی۔ گانا

او۔ کے۔ ہوگیا۔

اس کے بعد مجھے پیغام ملا کہ وہ اس ریکارڈنگ سے مطمئن نہ تھے اور مجھے اس گانے کو دوبارہ گانے کو کہا۔ میں نے چند دنوں کی مہلت مانگی کیونکہ میں دیگر گانوں کی ریکارڈنگ میں مصروف تھی۔ چند دوستوں کی محبت کی وجہ ہمارے درمیان غلط فہمی پڑ گئی اور دادا نے کسی اور گلوکارہ کی آواز میں وہ گیت ریکارڈ کرلیا۔ راجو بھرتن مزید لکھتے ہیں کہ جے دیو جو کہ ایس۔ ڈی کے معاون موسیقار تھے جس کا حوالہانے "چند دوستوں" کے زمرے میں کیا تھا، جب استفسار کیا گیا تو ان کا کہنا تھا کہ وہ گانا "چپ چھپکے چلت، بل کھائے، ہائے سیاں کیسے دھروں دھیر" فلم 'ستاروں سے آگے' کا گیت تھا اور وجنتی مالا پر فلمایا جانا تھا۔ یہ ذکر 1958ء کا ہے۔ یہ گانا ایس۔ ڈی کے معیار پر پورا نہ اُترا تھا قسمت کا کرنا یہ ہوا کہ یہی دھن بعد میں لتا نے فلم گائیڈ کے گانے سیاں بے ایمان، کیلئے گائی حالانکہ ایس۔ ڈی۔ اس تاثر سے اتفاق نہیں کرتے۔

بہرحال! اس معاملے کو نپٹانے کے لئے میں نے لتا جی کے تاثرات بیان کیے وہاں جے دیو کی کہانی بھی بیان کرتا ہوں۔ "دادا نے مجھے لتا کو فون کرنے کو کہا کہ وہ دوبارہ گانا گا دیں۔ ابھی فون بند نہیں ہوا تھا کہ لتا کا پیغام کہ وہ بیرون ملک جا رہی ہیں اور واپسی پر گانا دوبارہ گا دیں گی۔ میں نے دادا کو جب یہ پیغام دیا تو وہ کہنے لگے کہ لتا کو کہو کہ واپسی پر گانا دوبارہ گا دیں گی۔ میں یہ پیغام اُسی وقت لتا کو دیدیا۔ لیکن لتا کہنے لگیں کہ وہ ٹیلی فون پر کوئی ایسا وعدہ نہیں کرسکتیں۔ اس پر دادا کا غصہ آ گیا۔ وہ کہنے لگے کہ ہمیں اس (لتا) کی ضرورت نہیں اگر وہ کوئی وعدہ نہیں کرسکتیں! اس معاملہ میں لتا کا کہنا تھا۔ "میں انتہائی مضمحل تھی۔ لیکن جب بھی کبھی میرا دادا سے سامنا ہوتا میں نمشکار کہتی اور وہ آگے بڑھ جاتے۔ مجھے یاد نہیں کہ یہ "بندنی" کی ریکارڈنگ کے دنوں کی بات ہے یا 'گائیڈ' کی کہ مجھے دادا کا پیغام گانا گانے کے لئے ملا۔

میں تذبذب کا شکار تھی۔ دریں اثنا مجھے دادا کا فون آیا کہ ان کے پاس میرے لیے کچھ کام ہے اور یہ کہ میں اُن کے پاس جاؤں۔ دادا نے مجھ سے ناراضگی کا اظہار کیا اور پھر میں نے دو خوبصورت گیت "جوگی جب سے تو آیا میرے دوارے" اور "اب کہ برس بھیج بھیا کو بابل" "تخلیق ہوئے" میں نے اپنی گزارشات میں لتا کے گائے ہوئے کئی گانوں کا تذکرہ کیا ہے لیکن دو عدد نغموں 'اب تو ہے تم سے ہر خوشی اپنی اور تیری بندیا رے' (مع محمد رفیع) کا ذکر لازم ہے جو کہ فلم 'ابھیمان' سے تھے

لتا اور جے دیو:

1961ء کی فلم 'ہم دونوں' کے دو عدد بھجن 'اللہ تیرو نام' اور 'پربھو تیرو نام' شاید لتا کی زندگی کے دو بہترین بھجن ہیں۔ تمہیں دیکھتی ہوں تو لگتا ہے ایسے' فلم 'تمھارے لیے' کے لئے بہت سحور کن لگتا ہے۔ اس گیت کو نقش لائل پوری نے لکھا تھا اور اداکارہ ودیا سنہا پر فلمایا گیا تھا۔ 1963ء میں جب سنیل دت کی وحیدہ رحمان کے ساتھ فلم 'مجھے جینے دو' ریلیز ہوئی تو اس کا نغمہ 'رات بھی ہے کچھ بھیگی بھیگی' چاند بھی کچھ مدھم مدھم، ایک سحر کن، رقص پر مبنی گیت تھا۔ ایک لوری نما گیت، تیرے بچپن کو جوانی کی دعا دیتی ہوں، بھی اس فلم میں شامل ہے کہ وحیدہ رحمان جب سنیل دت کے بچے کی ماں بنتی ہے تو وہ اُسے دعا دیتی ہے کہ وہ باپ کے نقش قدم پر نہ چلے جسے نامساعد حالات نے ایک ڈاکو بنا دیا تھا۔

جے دیو کو بحیثیت موسیقار چیتن آنند کی فلم 'جورو کا بھائی' میں کام ملا تھا جس میں لتا اور طلعت محمود کے علیحدہ علیحدہ گایا ہوا نغمہ 'صبح کا انتظار کون کرے' بہت مدھر گیت ہے۔ وجے آنند کی اس فلم کے ستارے جانی واکر، شیلا رامانی اور بلراج ساہنی تھے۔ جے دیو کی موسیقی کے حوالے سے 1977ء کی فلم 'آلاپ' ایک خصوصی توجہ کی طالب ہے۔ رشی کیش مکر جی کی اس فلم کو این۔ سی۔ سپی کی ہدایتکاری سونپی گئی۔ ستارے 'امیتابھ بچن ریکھا، اوم پرکاش سنجیو کمار اور اے۔ کے۔ ہنگل تھے۔ لتا نے اس فلم کیلئے ایک خوبصورت نغمہ' کا ہے منوا ناچے بھرا' گایا۔ جے۔ دیو نے اس فلم کی موسیقی پر منگیشکر مدھیا پردیش گورنمنٹ ایوارڈ حاصل کیا۔ فلم 'ریشماں اور شیرا' کیلئے جے دیو کو نیشنل فلم ایوارڈ، بحیثیت بہترین موسیقار 1972ء میں دیا گیا (گانے: اک میٹھی سی چبھن اور تو چندا میں چاندنی) یہ بدقسمتی کی بات ہے کہ جے۔ دیو کا کافی سارا میوزک، فلمیں نہ بننے کی وجہ سے منظر عام تک نہ آسکا۔ خوش قسمتی سے پنچل سٹوڈیوز لاہور میں عزت مجید، جے دیو کے بدائی کے گانے 'مورا نیہر چھوٹل جائے' کے ساتھ ساتھ دیگر گانے دوبارہ ریکارڈ کرکے، ان خوبصورت دھنوں کو زندہ کر رہے ہیں!

آر ڈی برمن اور لتا:

ایس ڈی برمن اور اُنکے معاون موسیقار جے دیو (جو اپنی ذاتی حیثیت میں ایک پایہ کے موسیقار بھی تھے) کی لتا کیساتھ سنگت کے بعد یہ قدرتی امر ہے کہ ہم ایس۔ ڈی۔ کے بیٹے آر۔ ڈی۔ برمن کی لتا کیساتھ سنگت کا بھی تفصیلی جائزہ لیں۔ میری ذاتی رائے میں فلم 'امر پریم' کا گیت 'رینا بیتی جائے' ان دونوں کی سنگت کی بہترین تخلیق ہے۔ اس گیت میں میلوڈی میں جو تبدیلیاں لائی گئی ہیں یعنی کہ لائن، شیام کو بھولا شام کا وعدہ، پر سُروں میں تبدیلی لانا اور پھر لائن 'رینا بیتی جائے، سے ملاپ کرنا' گانے میں مشکل اور سُننے میں آسان اور بھلا معلوم ہوتا ہے۔

آر۔ ڈی کی اصل تربیت اُس دور میں ہوئی

ارمانوں سے رکھا ہے بلم تیری قسم، پیار کی دنیا میں یہ پہلا قدم 1950ء میں فلم 'نوبہار' کیلئے روشن کا ترتیب دیا ہوا، لتا کی آواز میں گیت، اے ری میں تو پریم دیوانی، میرا درد نہ جانے کوئی، بہت مقبول ہوا۔ اس گیت میں بدلتی رُتوں کے ساتھ بدلتے راگوں میں ہر انترے کی بندش سحر میں مبتلا کر دیتی ہے۔ 1952ء میں جب راج کپور اور نرگس کی فلم 'انہونی' کی نمائش کی گئی تو راج کپور کے ہر دلعزیز گلوکار مکیش کے بجائے انکو طلعت محمود کے ساتھ لتا کا گایا ہوا گیت 'ہیں پیاسے نین بیچارے ذرا خیال رہے' پر اکتفا کرنا پڑا۔ یہ خوبصورت گیت ہے۔ ایک اور دوگانہ جو کہ لتا اور راج کماری نے گایا، زندگی بدلی محبت کا مزاج آنے لگا، رمبا سمبا، تال میں ایک انوکھا تجربہ تھا۔ لتا نے اس فلم میں ایک اور خوبصورت نغمہ اس دل کی حالت کیا کہیے جو شاد بھی ہے ناشاد بھی ہے، گایا تھا۔ اس فلم میں لتا نے اپنی روایت سے ہٹ کر ایک مُجرا گیت، کہا ہے انہوں نے یہ راز محبت قسم ہے تمہیں تم کسی سے نہ کہنا گایا تھا۔

1960ء کی دہائی لتا اور روشن کے اشتراک کا ایک سنہرا دور تھا۔ اس دہائی میں فلم 'انوکھی رات' کے لئے لتا نے اس فلم کی پُر اسرار کہانی ہیں، جس میں ایک ڈاکو، ایک گھر میں پناہ لیتا ہے اور سب کردار اپنی اپنی کہانی سُناتے ہیں ایک خوبصورت گانا محلوں کا راجہ ملا کر رانی بیٹی راج کرے گی، گا کر داد تحسین حاصل کی۔ لیکن موسیقی کے اعتبار سے 1964ء کی فلم 'چتر لیکھا' ایک بہت بڑی فلم تھی۔ اس فلم میں سب نمایاں اداکاروں نے مضبوط کردار نبھائے۔ اشوک کمار بحیثیت بیج گپت اور محمود بحیثیت برہم چاری شویتک۔ یہ فلم جو ناول (چتر لیکھا) کی کہانی پر مبنی تھی، جو کہ زندگی کے فلسفہ پر، بھگوتی چرن ورما (1934ء) کی تحریر تھی، میں لتا کے گیتوں نے رنگ جما دیا۔

جیسا کہ:

☆ سکھی ری میرا من اُلجھے تن ڈولے

☆ اے ری جانے نہ دوں گی

سرود اور سارنگی نے ان گانوں میں اپنا جادو جگایا

اس دور کے ماحول کو اُجاگر کرنے کیلئے عورت کی مجسموں کے ذریعے اس دور کی تہذیب کو نمایاں کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ لتا کے ایک خوبصورت گیت میں اس دنیا پر ایک نشتر چلایا گیا ہے۔ اس گیت کے بول ہیں 'سنسار سے بھاگے پھرتے ہو' بھگوان تو تم کیا پاؤ گے، جس کو مینا کماری نے اعلیٰ کردار کاری کے ذریعے فلمایا ہے۔ لتا اور روشن کی دیگر کمرشل کامیاب فلمیں ہیں: تاج محل (1963ء) آرتی (1962ء) دل ہی تو ہے (1963ء) بھیگی رات، وغیرہ۔ فلم 'بھیگی رات' کا خوبصورت نغمہ، دل جو نہ کہہ سکا وہی راز دل کہنے کی رات آئی۔ میں اکثر نجی محافل میں گاتا ہوں۔ فلم 'تاج محل' کا گیت 'جو وعدہ کیا ہے نبھانا پڑے گا' بھی ایک لافانی نغمہ ہے (لتا۔ رفیع)۔ اس کے علاوہ گیت، اب کیا مثال دوں میں تمہارے شباب کی اور' کبھی تو ملے گی' کہیں تو ملے گی (آرتی 1962ء) اور غزل جرم الفت پہ ہمیں لوگ سزا دیتے ہیں (تاج محل 1963ء) لاجواب پیشکش ہیں۔ موسیقی کے اعتبار سے فلم 'ممتا' کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ کہ اس فلم میں جہاں لتا نے گیت 'رہیں نہ رہیں ہم' باکمال انداز میں گایا ہے وہاں ان کا ہیمنت کمار کے ساتھ گایا ہوا گیت 'چھپا لو یوں دل میں پیار تیرا' ایک خوبصورت دوگانا ہے۔ کن رس ساتھیوں نے یہ بات نوٹ کی ہوگی کہ ان دنوں شاعری اور موسیقی کا امتزاج کتنا شاندار ہوتا تھا۔

لتا۔ روشن کے دیگر گیت ہیں

یہ سُرخی اور یہ شام

(فلم: چھورا چھوری 1955ء)

نعت رسول مقبول

جب نبیؐ کے ہجر میں بہتی ہے زندگی
مہکی ہوئی گلاب سی رہتی ہے زندگی
خلدِ بریں عزیز ہے لیکن مرے خدا
مجھ کو بسا مدینے میں کہتی ہے زندگی
یہ آندھیاں جو آتی ہیں حزن و ملال کی
طیبہ کی آس ہی میں تو سہتی ہے زندگی
گر سنتِ رسولؐ کی یہ پیروی کرے
پھر اجتماعِ حُسن میں رہتی ہے زندگی
یہ آنکھ و دل کی راہوں کو رکھتی ہے جلوہ گر
مجھ کو مجیدؔ ایسے ہی کہتی ہے زندگی

عبدالمجید چٹھہ/لاہور

پاکستان فضائیہ کے لیے ایک نغمہ

ارضِ وطن سے اوجِ فلک تک بازی گاہ ہماری ہے
ہم شہباز ہیں شہبازی میں طاق سپاہ ہماری ہے
ہم نگران ہیں پاکستان کے گلزاروں صحراؤں کے
کوہستانوں بہتے چشموں موج بھرے دریاؤں کے
دیس کی ہر اک سرحد ہم کو اپنی جان سے پیاری ہے
ہم شہباز ہیں شہبازی میں طاق سپاہی ہماری ہے
ہم رکھوالے ہستی بستی جنت کے نظاروں کے
ہستی کی شاداب رُتوں کے دلآویز بہاروں کے
اپنا دیس حقیقت میں آزادی کی پھلواری ہے
ہم شہباز ہیں شہبازی میں طاق سپاہی ہماری ہے
آج ہوا بازی کے اُفق پر روشن نام ہمارا ہے
ایم ایم عالم اور راشد سے زندہ کام ہمارا ہے
اور حسن صدیقی کی پرواز برابر جاری ہے
ہم شہباز ہیں شہبازی میں طاق سپاہ ہماری ہے

مظفر حسن منصور/خوشاب

خط بنام انور مقصود

امین کنجاہی

انور میاں کیسے ہو؟انور ناراض مت ہونا میاں لکھ دیا ہے،کافی دن سے سوچ رہا تھا، کہ تمھیں عالم زریں کی طرف سے بھی خط لکھا جائے،انور اب یہ کام میں نے اپنے سر لے لیا ہے اور ہاں اگر اپنا واٹس اپ نمبر لکھ کر بھیج تو ذرا خط لکھنے میں آسانی ہوگی تمھارے نمبر کا مطلوب امین کنجاہی!

چلو ایک رات انتظار کرنے کے بعد کہ شاید تم نمبر بھیج دو مگر دل کہتا ہے کہ تم نے ابھی تک میرا پیغام پڑھا نہیں مگر پھر بھی دل میں وسوسوں نے دھرنا دے دیا کہ نہیں انور میاں نے پڑھ کر اگنور کیا ہے میں نے ہمیشہ دل کی مانی ہے اور ہمیشہ نقصان اُٹھایا ہے میں بھی کیا باتیں لے بیٹھا انور میاں اب ذرا زمین والوں کی چند باتیں ہو جائیں ہابیل سے قابیل تک کا جو فساد شروع ہوا وہ ابھی تک چل رہا ہے زور آور کمزور کو مار رہا ہے،لوٹ رہا ہے،کوئی روکتا نہیں،کوئی ٹوکتا نہیں،زمین پر ایسے ایسے ظلم کے سونامی چل رہے ہیں کہ یہ بات تم جیسے ذہین قلم کار بھی جانتے ہو مگر انور میاں کیا یہ سب ناانصافیاں ابد تک چلتی رہیں گی؟اور کیا عدل اور انصاف کے نام پر آنے والے ان ظالم طاقتوں کے سامنے بے بس اور مجبور ہی رہیں گے؟لوگ مرتے رہیں گے؟مظلوم کو ظلم کا نشانہ بنایا جاتا رہے گا؟انور پریشان ہو گئے؟ ہونا بھی چاہیے ،تم نے تو تقسیم بھی دیکھی ہے،میں نے تو اپنی دور میں آنکھ کھولی اور آج تک وہی حالات ویسے ہی ہیں،اللہ جانتا ہے!کب ہمارے حالات ٹھیک ہوں گے ملک میں امن قائم کب ہوگا؟ہم سب خوشحال ہوں گے؟ملک میں آسانی کب آئی گی؟تعلیم عام کب ہوگی؟مریضوں کو مفت دوائیاں کب ملیں گی؟مظلوموں کے قاتل کب پکڑے جائیں گے؟

انور تمہیں یہ خط لکھنے کا اصل مقصود یہ ہے اور جو سبب بنا وہ یہ کہ،ایک تو سانحہ ماڈل ٹاؤن جو کہ ابھی تک نہ سلجھایا جاسکا اور دوسرا سانحہ ساہیوال جس نے پورے ملک کو ہلا کار کھ دیا ہے اور انور تمھارے ساتھ ایک اور واقعہ شیئر کرنا چاہ رہا ہوں یہ 5 جون 1992 کا دور تھا ٹنڈو بہاول سندھ کے ایک گاؤں میں ایک حاضر سروس میجر ارشد جمیل نے فوج کے جوانوں کے ساتھ چھاپہ مار کر 9 کسانوں کو گاڑیوں میں بیٹھایا اور جام شورو کے نزدیک دریائے سندھ کے کنارے لے جا کر گولیاں مار کر قتل کر دیا فوج کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ یہ افراد دہشت گرد تھے اور ان کا تعلق بھارت کے ادارے ریسرچ اینڈ اینالائس ونگ سے تھا۔لاشیں گاؤں آئیں تو نہ صرف گاؤں بلکہ پورے علاقے میں کہرام مچ گیا ہر ماں اپنے بیٹے کی لاش پر ماتم کر رہی تھی ان ماؤں میں ایک 72 سال کی بوڑھی عورت مائی جندو بھی تھی اس کے سامنے اس کے دو بیٹوں بہادر اور منٹھار اور اس کے داماد حاجی اکرم کی لاش پڑی تھی مگر وہ خاموش تھی مائی جندو سکتے کے عالم میں بیٹوں اور داماد کے سفید چہرے دیکھے جارہی تھی انور ہر شخص کہہ رہا تھا کہ خاموشی سے میتیں دفنا دی جائیں قاتل بہت طاقت ور ہیں ان غریب ہاریوں کا ایسے طاقت،،اوں سے کیا مقابلہ مائی جندو کو بار بار رونے کے لئے کہا گیا تو اس نے دہشت ناک آنکھوں سے میتوں کی طرف دیکھا اور بولی بس مائی جندو ایک ہی بار روئے گی جب بیٹیوں کے قاتل کو پھانسی کے پھندے پر لٹکتا دیکھے گی سب جانتے تھے ایسا ممکن نہیں تھا مگر لوگ خاموش ہو گئے مائی جندو کی بیٹیاں گر لا رہی تھیں مگر مائی جندو ساکت بیٹھی قتل ہونے والوں کے میتوں کو دیکھی جارہی تھی انور میاں جنازے اُٹھے تو مائی جندے نے سر کی چادر کمر سے باندھی سیدی کھڑی ہوئی اور لہو ہوتے جگر کے ساتھ بیٹوں کو الوداع کیا مسئلہ یہ تھا کہ یہ ٹنڈو بہاول اندرونِ سندھ کا ایک دور دراز گاؤں تھا اور تب دریائے سندھ کے اس کنارے قتل ہونے والوں کی ویڈیو بنانے کے لئے موبائل کیمروں کا دور بھی نہیں تھا ملک اور سندھ بھر میں خبر چلی کہ دشمن کے ایجنٹ مار کر ملک کو بڑے نقصان سے بچا لیا گیا ہے،جس نے پڑھا سنا اُس نے شکر کیا جب سارا ملک شکرانہ ادا کر رہا تھا تب مائی جندو نے احتجاجی چیخ ماری اس چیخ نے پرنٹ میڈیا کی دُنیا میں ہل چل مچا کر رکھ دی مائی جندو بوڑھی تھی جسمانی لحاظ سے کمزور مگر وہ تین مقتولوں کی ماں تھی اس نے طاقت کے مراکز سے جنگ کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اپنی دو بیٹیوں کو ساتھ لے کر قاتلوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا یہ جنگ آسان نہ تھی مگر نقارے بج چکے تھے کشتیاں جل چکی تھی،واپسی محال تھی اخباروں اور صحافیوں کے ہمراہ مائی جندو نے اس چیخ کو طاقتی مراکز کے سینوں میں گھونپ دیا پہلی جھڑپ ختم ہوئی اور گرد چھٹی تو معلوم ہوا کہ قتل ہونے والے دہشت گرد نہ تھے بلکہ میجر ارشد جمیل کا اُن کے ساتھ زرعی زمین کا جھگڑا تھا جس کی سزا میں انھیں قتل ہونا پڑا 24 جولائی

1992 کو جنرل آصف نواز اور نواز شریف نے ملاقات کی اور جنرل آصف نواز نے میجر ارشد جمیل کا کورٹ مارشل کرنے کا حکم دے دیا 29 اکتوبر کو فیلڈ جنرل کورٹ مارشل نے میجر ارشد جمیل کو سزائے موت اور 13 فوجی اہل کاروں کو عمر قید کی سزا سنادی میجر نے پاک فوج کے سپہ سالار کو رحم کی اپیل کی جو 14 ستمبر 1993ء کو مسترد ہوئی اس کے بعد رحم کی اپیل صدر فاروق لغاری سے کی گئی جو 31 جولائی 1995ء کو مسترد کر دی گئی لیکن سزا پر عمل درآمد روک لیا گیا اس کے بعد میجر ارشد جمیل کے بھائی کی اپیل پر سپریم کورٹ کے جج سعید الزماں صدیقی نے حکم امتناع جاری کیا اور سزا روک دی سزائے موت پر عمل نہ ہونے پر 11 ستمبر 1996ء کو مائی جندو پھر میدان میں نکل آئی اس کی دو بیٹیوں نے حیدر آباد پریس کلب کے سامنے اپنے جسموں پر تیل چھڑک کر خود کو آگ لگا لی ان کو نازک حالت میں ہسپتال لے جایا گیا مگر وہ بچ نہ سکیں پورے ملک میں ایک بار پھر کہرام مچ گیا بالآخر 28 اکتوبر 1996ء کو طاقت کی دیواریں مائی جندو کے مسلسل دھکوں کے سامنے ڈھیر ہو گئیں یہ حیدر آباد سینٹرل جیل تھی، جہاں مائی جندو کو پھانسی گھاٹ پر لایا گیا سامنے تختہ دار پر اس کے سامنے اس کے گاؤں کے نو بیٹوں کا قاتل میجر ارشد جمیل کھڑا تھا تختہ دار کھینچا گیا، تو قاتل میجر ارشد جمیل کا جسم دار پر جھول گیا، اسی وقت سامنے کھڑی مائی جندو کی بوڑھی مگر زور آور آنکھ سے ایک اشک نکلا اور اس کے رخسار کی جھریوں میں تحلیل ہو گیا انور میں اگر 1992ء کا یہ واقعہ اکتوبر 1996ء تک کسی نہ کسی طرح بے گناہوں کی اور مظلوموں کی دعاؤں اور آہوں کی وجہ سے عدل اور انصاف حاصل کر سکا تو کیا وجہ ہے کہ سانحہ ماڈل ٹاؤن جس میں کہ 14 بے گناہ خواتین و حضرات کی جانیں لی گئیں اور اس سانحہ پر ایک جے آئی ٹی بھی بنائی گئی مگر آج تک اُن قاتلوں کو نہیں پکڑا گیا اور اسی طرح کا جو واقعہ سانحہ ساہیوال میں ہوا اور جس میں بے گناہ انسانوں کی جانیں لے لی گئیں اور وہ بھی یونیفارم میں ملبوس ملک کے محافظ، پولیس، پنجاب پولیس کے افراد پر مشتمل لوگوں نے ایک ایسا عمل کیا جس نے پورے سوشل میڈیا اور موبائل فونز پر تہلکہ مچا دیا مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ انور کیا آج تک اور ابھی شاید کتنے برس تک ایسے بے شمار واقعات ہوتے رہیں گے اور اُن واقعات اور سانحوں پر کوئی عدل اور انصاف کسی غریب اور لاچار کو نہیں مل پائے گا انور کیا یہ کھلا تضاد نہیں ہم عام اور غریب لوگ کس کے آگے اپنے دامن کو پھیلائیں اور عدل اور انصاف مانگیں انور میاں اب آنکھوں میں پانی آنے لگ پڑا ہے پھر کچھ دن کے بعد اگر تم نے جواب دیا تو مزید بات ہوگی اور عالم زریں کے اور کچھ زخم گھاؤ اور ظلم کی کچھ داستانیں تمہارے ساتھ شیئر کرنے کی کوشش کروں گا اُمید کرتا ہوں کہ تمہیں بھی عالم بالا سے کوئی خط ضرور ملے گا کہ جس میں تمہیں غالب جوش صاحب، فیض صاحب، فراز اور منیر کی طرف سے حالات کا پتا چلے فلحال جو میرے دل پر گزری جو میری روح نے برداشت کی وہ میں نے انور تمہارے ساتھ بیان کر دی ہے اب جو کہ قلم کا دور نہیں رہا اس دور میں کمپیوٹر کے کی پیڈ سے اجازت چاہوں گا۔

تمہارا خیر اندیش

فقط دعا گو

امین کنجاہی اسلام آباد سے

مولانا حامد علی خاں کی یاد میں شاہد علی خاں کی زیر ادارت شائع ہونے والا مجلہ

الحمراء

ادبی صحافت میں مقبولیت کے سنگ میل عبور کرتا ہوا گزشتہ اٹھارہ برس سے ہر ماہ باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے

اپنے ادبی ذوق کی تسکین کے لیے بک سٹال سے طلب فرمائیں یا ہم سے براہ راست منگوائیں

رابطہ کے لیے دفتر ماہنامہ الحمرا: j-24 ماڈل ٹاؤن، لاہور 0333-4001844

ایک تھا سچ (عباس خان کی کتاب ''سچ'' کا ایک افسانوی تجزیہ)

صدف منیر

وہ خورشید قصوری روڈ گلبرگ کا ایک قدرے کم مقبول تھائی کیفے تھا۔ سر عباس خان طے شدہ وقت سے تقریباً پندرہ منٹ پہلے پہنچ چکے تھے۔ خان صاحب اُن دنوں لاہور میں عدلیہ کے ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ چونکہ مجھے اُن کے ادب، فلسفے اور تاریخ سے شدید لگاؤ اور اُن علوم پر اُن کی دسترس کا پوری طرح اندازہ تھا لہٰذا میں بھی اپنا ہوم ورک پورا کر کے آئی تھی۔ ''کافے مالے'' Café Malée کی دریافت کا کریڈٹ میری ہم نام دوست صدف کو جاتا تھا جس کے ساتھ کبھی نہ ختم ہونے والی نشستوں کا آغاز، یہیں اسی کافے میں، جرمن فلسفی Hans-Georg)☆Gadamer Gadamer..... متوفی: 13 مارچ 2002ء، Heidelberg) کی آرٹ کی شرح و تنقید سے شروع ہوا اور آج تک جاری و ساری ہے۔

میں ''کافے مالے'' کے فرسٹ فلور پر، پارٹی لاؤنج کے ایک نیم تاریک پرسکون گوشے میں، اپنی نوٹ بک پر بے معنی لکیریں کھینچتے ہوئے، خان صاحب کو داخلی زینے کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ وہ پاشا کی سفید شلوار قمیص پر لارنس پور کی کالی واسکٹ پہنے چلے آ رہے تھے۔ اُن کے ہاتھ میں سگار اور آنکھوں پر سیاہ چشمہ، اُن کے نفیس ذوق کا پتہ دے رہا تھا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد اُنہوں نے میرے مشاغل اور مضامین کے بارے میں استفسار کیا: میں اُن دنوں گورنمنٹ کالج میں ایم اے فلسفہ پریویس کی طالبہ تھی، میری شخصیت اُن دنوں، ذہن و دل کی کسی اور خیالات و نظریات کی کہن سالی کی غماز تھی۔ یہ تضاد اتنا واضح تھا کہ اپنے ہم عصروں کے مشاغل دل کو نہ بھاتے تھے اور اساتذہ میری ذہنی میچورٹی کو estimate کرنے سے قاصر تھے۔ خان صاحب سے ملاقات اس تکلیف دہ کیفیت کے نتیجے کے طور پر پیدا ہونے والے نفسیاتی خلا کو پُر کرنے کی ایک کوشش تھی۔

بات Pre-Greek Civilization سے شروع ہو کر یونانی فلسفے کے عروج اور پھر اُس کے انحطاط سے گذر کر سلطنتِ روم کا فکری جائزہ لیتی ہوئی قرونِ وسطیٰ میں جھانک کر مسلم نشاۃِ ثانیہ کو مسرت سے تکتی اور پھر Italian Renaissance سے نکلتی جدیدیت کو موضوع بحث بناتی عقلیت پسندی کی اجارہ داری پر آ کر رُک گئی۔

خان صاحب اُن دنوں ''سچ'' کے موضوع پر ایک کتاب لکھ رہے تھے جو اُن کی زندگی کا ایک میگا پراجیکٹ تھا۔ ویسے تو ''سچ'' کے بارے میں کم از کم فلسفیانہ سطح پر کوئی حتمی و اٹل مفہوم تو سامنے نہیں آ سکا؛ خان صاحب کی کتاب تاریخ فلسفہ کے حوالے سے، سچ کے بارے میں بنتے اور ٹوٹتے مختلف نظریات کا ایک تنقیدی جائزہ تو تھی ہی لیکن اس کے ساتھ ساتھ ''سچ'' کا ایک Historical frame of reference بنانے کی بھی ایک زبردست کوشش تھی۔

''مملکتِ خداداد'' میں وہ enlightened moderation کا دور تھا؛ دنیا اکیسویں صدی میں داخل ہو رہی تھی اور ہمارے ملک میں ایک پروگریسو اور زیرک ڈکٹیٹر کی ''جمہوری'' حکومت قائم تھی جبکہ ریاست میں دو متضاد قدروں کی ideological hegemony تھی۔ ایک طرف تو کلچرل فیسٹیول اور روشن خیالی کے نام پر striptease اور آزاد میڈیا کے رُجحان نے زور پکڑا اور دوسری طرف ریاستی سرپرستی کے زیرِ اثر تیزی سے اُبھرتی ہوئی شدت پسندی نے۔ خان صاحب کی کتاب کے ابتدائی ابواب پر (بات) بحث شروع ہوئی تو شام گہری تاریکی میں ڈوب چکی تھی اور اُن کے سگار کے کش سے گہرے اضطراب کے مرغولے بن رہے تھے۔

خان صاحب نے خالص عالمانہ روش کو اپناتے ہوئے؛ اپنی بیوروکریٹک ملازمت کی وجہ سے حاصل ہونے والے وسیع تر exposure کو استعمال میں لاتے ہوئے برصغیر کے تہذیبی تنوع کے پس منظر میں religion based absolute values کا فلسفیانہ تجزیہ اور اُس کے نتیجے میں بننے والی بین التہذیبی معاشرت اور اس سے جڑی pluralist ideology کو سمجھتے اور سمجھاتے ہوئے برصغیر کے انسان کی نفسیاتی پرتیں کھولتے ہوئے اور ''سچ'' کے بارے میں قائم perspectives کی گرہیں کھولتے ہوئے مجھے اپنے گہرے فہم کے حصار میں جکڑتے گئے۔

اگلے باب میں برصغیر کے انسان سے ایک قدم آگے اپنے تجربے کو بڑھاتے ہوئے اپنی دانش کے

کینوس پر انسان کی تاریخ کو رقم کرتے ہوئے، تاریخ دان فلسفی آرنلڈ ٹوائن بی کی علمی کاوش کو رنگوں کی صورت بکھیرا اور پھر اُس کے تاریخی ماحصل کا ایک اور چوٹی کے تاریخ دان فلاسفی Vico کے ساتھ موازنہ کر کے حضرتِ انسان کے وجود کی ابتداء کی ارتقائی منازل کا جائزہ اور اساطیری گردش سے حاصل ہونے والے vision کو دوبارہ کینوس پر منتقل کیا اور اُس کے نتیجے میں جو مونتاژ montage بنا وہ اِس بات کا عکاس تھا کہ ''سچ'' کی اساس کسی تجرید پر نہیں رکھی جا سکتی۔ بالفرضِ محال؛ سچائی کو کسی تجریدی قدر کے against پرکھیں تو یہ پرکھ انسان کے لیے کلی طور پر کارآمد نہیں۔ انسان کو سمجھنے کے لیے اور اُسے عصری تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کے لیے reductionist principle یا positivist approach کی ضرورت نہیں بلکہ humanist principle کی سمجھ درکار ہے۔ ویکو نے homosepien سے پہلے زمین پر مختلف جینز کے حامل انسان کی تاریخ لکھی اور یہ بھی بتایا کہ آج کا homosepien پہلے ages of Gods اور پھر ages of giants کے مختلف ارتقائی مدارج طے کر کے آج تک پہنچا ہے۔ اس homosepien کی موجودہ تشکیل میں اُس نے جسمانی سطح اور شعوری سطح پر بے پناہ ترقی کی ہے لیکن انسان کی بنیادی سرشت نہیں بدلی اور نہ ہی وہ اپنی اس بنیادی جبلت پر قابو پا سکا ہے۔ لہٰذا ویکو آفاقی سطح پر تہذیبی اساس کا جائزہ لیتے ہوئے مختلف اقوام کی معاشرتی اقدار اور نظریات پر حاوی ہوتا دکھائی دیتا ہے۔

وقت اور خان صاحب کی کتاب کے ابواب کچھ اور آگے بڑھے اور اِس دوران اُنھوں نے اپنا تیسرا سگار اور میں نے کافی کے تین مگ ختم کر ڈالے۔ وقت کچھ مزید آگے سرکا اور میں نے ایم اے فلسفہ کرنے کے بعد شہر کے کارپوریٹ کلچر کے نمائندہ گرلز کالج میں بطور لیکچرار پڑھانا شروع کر دیا اور دوسری طرف خان صاحب کی ''سچ'' کے ساتھ علمی و جذباتی وابستگی نے اُن کے شعور سے پورا پورا خراج وصول کیا۔ تاریخ گواہ ہے کہ خراج تو اہلِ فہم و نظر پوری جی داری سے دیتے ہی آئے ہیں؛ شدہ نظریات کو live as a principle کرنے کی قیمت سقراط نے بھی زہر پی کر چکائی تھی۔ ویسے بھی میرے نزدیک کاملیت کو کلی طور پر حاصل کرنا ممکن نہیں۔ ایک domain میں مکمل پرفیکشن دوسرے پہلوؤں کے decadence پر مبنی ہے۔

جوں جوں ''سچ'' کی تلاش کا سفر آگے بڑھا تو خان صاحب کا فشارِ خون بھی...... کافی مالے کا وہ نیم تاریک گوشہ جو میری اور خان صاحب کی perpetual presence کے نام ہو چکا تھا۔ ''سچ'' پر بحث اب اٹھارویں صدی اور انیسویں صدی میں مغرب میں پیدا ہونے والی جدیدیت کے ردِعمل کے طور پر اُبھرنے والی ادبی اور سیاسی تحریکوں میں داخل ہو چکی تھی۔ انسان کا فہم عقلیت اور تجربیت کے وضع شدہ سچائی کے پیمانے پر کھ کر 'جرمن تنقیدی مثالیت پسندی' کے ادوار میں داخل ہو چکا تھا۔ یہاں کانٹ نے نظریات نے starry heavens above me اور moral laws within me کا فرق واضح کر کے دنیائے فلسفہ کو یہ باور کروایا کہ کائنات کے طبعی اصول physical laws کے تابع ہیں اور انسان کی معاشرت کے اصول moral laws کے تابع ہیں اور ہوتے چاہیں۔

خان صاحب کی کتاب کے ابواب اور دنیائے مغرب خرد افروزی والے turbulent period سے گذر رہی تھی اور ہیگل کے فلسفے نے پوری کائنات کی گردش کو از سرِ نو، تاریخ کے آفاقی دھارے میں جدلیاتی اصول کے تابع کیا۔

تکونی شدت اپنے اندر کی مساوات اور عدل وعقلیت اور جمہوریت کا راستہ ہموار کرتی ہوئی، آمرانہ رویوں، بادشاہت، خون ریزی اور ناانصافی کا خاتمہ کرتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھتی ہے۔ یہ تکونی شدت ہی اصل سچائی ہے۔ ایک absolute reason ہی کائنات کے بنیادی اصول وضوابط کا راز ہے۔ اِس راز کو پانے میں اور اُس absolute reason کو پانے میں اقوامِ عالم نے اپنا اپنا حصہ ڈالتی رہی ہیں۔ لہٰذا وہ اقوام جو علوم وفنون میں اپنی تہذیب کی عظمتِ رفتہ اور جمہوریت کی dominance کی عکاسی کرتی ہیں، وہی اِس تکونی شدت (Thesis/Antithesis/Synthesis) میں فتح پاتی ہیں۔ یہ یاد رہے کہ ہیگل کے ہاں فتح کا مطلب Supermacy of reason ہے۔

لیکن ''سچ'' کو سمجھنے کے لیے ابھی فلسفے کی بہت سی باطنی اور نفسیاتی گرہیں کھلنا باقی تھیں اور وقت کچھ مزید آگے سرک چکا تھا۔ ادھر ہمارے ہاں enlightened moderation اور مذہبی شدت کے ''ناجائز اختلاط'' سے پیدا ہونے والی صورت ملک میں خوفناک دہشت گردی کی صورت

اختیار کر چکی تھی۔ خونریز سرفروش اُسی ''سچ'' کی تلاش میں ہی clash of view کی وجہ سے ہی ملک کے ہر گلی محلے میں نسل کشی کرتے پھر رہے تھے۔ سچائی کی اٹوٹ بنیاد جو غارِ حرا، ہمالیہ کے دامن اور کاشی کے میدانوں میں جنم لینے والے تین خوبصورت انسان دوست نظریات، احدیت، محویت اور کثرتیت کی تہذیبی سنگت پر رکھی گئی اور جو برصغیر کے ہر ہر باسی کے collective consciuos میں جڑی ہوئی تھی اور سر عباس خان جس کے راوی تھے؛ وہ بری طرح بکھر چکی تھی۔

اب مذہبی کثرتیت کے وہی حوالے نا قابلِ ذکر اور کفر کے بول قرار پا چکے تھے۔ یہ سوچ کہ سچائی جدلیاتی عمل کا منطقی نتیجہ ہے، اپنی موت آپ مر چکی تھی۔ ''سچ'' کی حیثیت Spinoza کے رد شدہ اور قابلِ گرفت افکار جیسی ہو گئی اور سچ کے متلاشی ہم دونوں کی بھی......

جو سفر عباس خان صاحب اور میں نے Café Malée کے پارٹی لاؤنج کے ایک نیم تاریک گوشے سے شروع کیا تھا وہ مخالف سمت سے آتے ہوا کے تیز جھکڑوں کا مقابلہ نہ کر سکا اور راستہ گم ہو گیا۔

وقت کے کٹہرے میں معقوم ہیگل کی تکونی شدت کے متاثر اور سچائی کے متلاشی میں اور عباس خان صاحب ایک دوسرے سے یہ بھی نہ کہہ سکے کہ ہم اپنی زندگی کی بے ثباتی اور حالات و نظریات کی بے یقینی ثابت کر کے ایک دوسرے کو متاثر نہیں کر سکتے اور نہ ہی اپنے اندر کی چیخ کو دبا سکتے ہیں؛ ہمیں اپنے سوالوں کے جوابات چاہئیں۔

لیکن سچ پر شروع ہونے والی dialogical understanding کا انجام مارکیز☆(Garcia Márquez...... کولمبین ناول نگار، متوفی: 17 اپریل 2014ء) کے شہرۂ آفاق ناول One hundred years of solitude کے اختتام جیسا ہوا؛ جیسے ہی خان صاحب کا مسودہ مکمل ہوا اور بابِ فہم میں جونہی اُنہوں نے پہلا قدم رکھا تو اُس کے ساتھ ہی ''سچ'' ایک شہرِ سراب ثابت ہوا کہ جیسے ہی وہ فہم و ذکا کے ساتھ جُڑا، ریت کی آندھی کی تاب نہ لا سکا...... شعور کے کینوس پر سچائی کے سارے نقش جو میں نے اور خان صاحب نے بولتے آئینوں کے سامنے بنائے تھے، ہوا میں تتر بتر ہو کر اپنی پہچان اور شناخت کھو گئے؛ بالکل اُسی طرح میں اور عباس خان صاحب بھی......

(نوٹ از ایڈیٹر: صدف منیر صاحبہ، کنیئرڈ کالج، لاہور میں فلسفے کی استاد اور صدر شعبہ ہیں)

سکول، کالج، یونیورسٹی کے طلبہ اور ریسرچ سکالرز کے لیے ہماری چند کتب

مضامین پطرس	پطرس	140/- روپے
مضامین فرحت اللہ بیگ	مرتبہ: ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی	350/- روپے
جاڑے کی چاندنی	غلام عباس	200/- روپے
مراۃ العروس مع فرہنگ	ڈپٹی نذیر احمد	200/- روپے
اُردو تحقیق صورت حال اور تقاضے	ڈاکٹر معین الدین عقیل	700/- روپے
اُردو ادب کا ارتقاء	ڈاکٹر وحید قریشی	150/- روپے
اُردو تنقید (انتخاب مضامین)	پروفیسر اشتیاق احمد	700/- روپے
اُردو غزل (غزل کی دو سو سالہ تاریخ)	ڈاکٹر یوسف حسین خان	800/- روپے
مقدمہ شعر و شاعری	الطاف حسین حالی	200/- روپے
مقالات اقبال	عبدالواحد معینی	400/- روپے
تنقیدات حسین فراقی	پروفیسر اشتیاق احمد	700 روپے
تنقید اور مجلسی تنقید	ڈاکٹر وزیر آغا	300/- روپے
تحقیق شناسی	ڈاکٹر رفاقت علی شاہد	500/- روپے
اصلاح تلفظ و املاء	طالب ہاشمی	250/- روپے
اُردو کے 25 افسانے	ڈاکٹر اورنگ زیب عالمگیر	500/- روپے
نیا افسانہ اور قاری	ڈاکٹر طاہر تونسوی	250/- روپے
ولی تحقیقی و تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر محمد اشرف خان	250/- روپے
فیض احمد فیض (تنقیدی مطالعہ)	ڈاکٹر طاہر تونسوی	400/- روپے
داستان اقبال	آمنہ صدیقہ	200/- روپے

ناشر: القمر انٹر پرائزز، غزنی سٹریٹ اُردو بازار، لاہور 042-37237500

تیرا خیال اور میں

ساحل سلہری/سیالکوٹ

شاہد ذکی قبیل سے تعلق رکھنے والے ممتاز شاعر رفیق لودھی کا اولین شعری مجموعہ ''ترا خیال اور میں'' اُس کے سچے، کھرے اور جدید تر غزل گو ہونے کی عمدہ گواہی ہے۔ رفیق لودھی معاصر غزل نگاروں میں ایک سنجیدہ فکر اور مختلف اسلوب کے شاعر طور پر اپنا مقام مستحکم کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ اُس کی غزلیں رومان و حقیقت کا بہترین امتزاج ہیں۔ اس نے اپنی ذات اور حیات و کائنات کو شاعری کا حصہ بنایا ہے۔ رفیق لودھی معاشرتی اقدار کا شاعر ہے، وہ سماجی شکست و ریخت کی مذمت کرتا ہے اور انسانی رشتوں کے تقدس کا پورا لحاظ رکھتا ہے۔ جدید اردو غزل کے اس شاعر کے یہ دو شعر ملاحظہ کیجیے:

بچھڑنے والے بچھڑتے چلے گئے لودھی
کسی دُعا کسی رشتے سے کٹ گئے ہم لوگ
شجر شجر سے گرے برگ آنسوؤں کی طرح
کہ ایک پھول کے مرنے پہ باغ رویا تھا

رفیق لودھی نے عہد حاضر کی عکاسی کے ساتھ ساتھ نئے زمانے کی خواہش کی ہے۔ اس کی متعدد غزلیں پرخار وادیوں میں سفر کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ اس نے عامیانہ قسم کے خیالات و مضامین کو اپنے تخلیقی جوہر سے ندرت اور جدت عطا کی ہے، مثلاً وصال کا موضوع اردو شاعری میں کوئی نیا نہیں لیکن رفیق لودھی نے وصال کو بھی ایک نئی جہت دینے کی کامیاب سعی کی ہے:

وصال جسم کوئی دائمی وصال نہیں
جدا جدا ہی رہیں گے ترا خیال اور میں
پرند شاخ پہ ہیں اور تتلیاں گلاب پہ
میں رو پڑا ہوں ہجر میں وصال دیکھتے ہوئے

رفیق لودھی نے اپنی ذات کے اندر کے الاؤ کو بھی شعری پیکر دیا ہے اور زمانے کے محسوسات، مشاہدات اور تجربات کو بھی نہایت عمدگی سے بیان کیا ہے۔ اس کی شاعری زندگی سے جڑی ہونے کے باوجود بھی بھرپور شعریت اور غنائیت رکھتی ہے۔ اس نے مجاز کے دائرے میں رہتے ہوئے واردات کی سچی اور کھری عکاسی کی ہے۔ وہ عصری مسائل کے تقاضوں سے بخوبی آگاہ ہے، اس نے غربت، معاشی عدم مساوات، طبقاتی تفریق اور موجودہ انسانی رویوں کا ذکر کیا ہے۔ اس حوالے سے وہ ترقی پسند جدید شعری میلانات سے متاثر نظر آتا ہے۔ یہ شعر دیکھیے:

بھوک رشتے نگل گئی لودھی
وقت نے آدمی کو بیچ دیا
ابھی چراغ تلے مستقل اندھیرا ہے
ابھی شعور کو انسان تک پہنچنا ہے

رفیق لودھی نے زمانے کی ناانصافی، استحصال کا شکار، مظلوم، مجبور، نچلے اور پسے ہوئے طبقے کی نمائندگی کی ہے۔ ظلم آخر ظلم ہے، ظلم کی رات کتنی بھی تاریک اور لمبی کیوں نہ ہو کٹ جاتی ہے۔ ظلم کا اندھیرا صبح کے آفتاب کے ہاتھوں زائل ہو جاتا ہے۔ لودھی کی شاعری مفلس، مجبور، لاچار اور حالات کے ستائے ہوئے افراد کے لیے امید کا پیغام بھی ہے۔ یہ شعر دیکھیے:

آئے گی نور کی بارات سفر کرتی ہوئی
تھک کے گر جائے گی جب رات سفر کرتی ہوئی
کہیں شمار نہیں رزق کا کسی کے پاس
فقط مجھی پہ قناعت سے آب و دانہ کھلا

رفیق لودھی متعدد جدید اردو غزل گو شعرا سے متاثر دکھائی دیتا ہے لیکن اس پر زیادہ اثرات شاہد ذکی کے مرتب ہوئے ہیں۔ اس بات کا اظہار وہ خود بھی کرتا ہے اور اس کی شاعری میں شاہد ذکی کا رنگ بھی بڑا واضح نظر آتا ہے، مثال کے لیے یا اشعار ملاحظہ کیجیے:

قریب ہوتے ہوئے فاصلے سے دیکھتا ہے
وہ شخص مجھ کو عجب زاویے سے دیکھتا ہے
کہاں کوئی مجھے میری نظر سے دیکھے گا
ہر آدمی کہ یہاں واسطے سے دیکھتا ہے
جسے بھی دیکھیے منظر اُٹھائے پھرتا ہے
تمام عمر نہ مجھ پہ میرا زمانہ کھلا
میری تو ناؤ سمندر کے بیچ تھی مضطر
قریب دور کنارا نہیں کھلا مجھ پہ
چٹان کاٹ رہا ہوں میں نوک ناخن سے
مرے جنون کو زخم جگر نہیں دیکھتا

ان اشعار سے محسوس ہوتا ہے کہ رفیق لودھی نے شاہد ذکی کی غزل کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور اپنے پیش رو جدید غزل گو شعرا کے شعری مجموعے بھی سرہانے رکھے ہیں۔ یہی اس کی پختہ گوئی کا راز ہے، وہ کافی ریاضت اور تخلیقی عمل سے شعر کو گزار کر اپنے جذبات و احساسات بیان کرتا ہے۔ اس نے حسن و عشق، ہجر و وصال، سماجی، سیاسی اور انسانی اخلاق و اقدار جیسے روایتی موضوعات کو منفرد انداز میں پیش کیا ہے۔ اس نے تشبیہ و استعارے کا عمدہ اور برمحل استعمال کر کے مصرعے کو خوب صورت، رواں اور تازہ بنایا ہے۔ رفیق لودھی نے متعدد نئی تراکیب بھی تراشی ہیں۔ اس نے غزل میں علامتی اور مختصر لہجہ بھی برتا ہے:

مجھے اندھیرے میں سائے دکھائی دیتے تھے
چراغ جلتے ہی مجھ پہ نگار خانہ کھلا
قید بدن میں روح تڑپتی ہے کس لیے
یہ کون آئنے میں دکھایا گیا مجھے
کسی نے چوم لیا ہے سلگتے ہونٹوں سے
مچل رہا ہے سو درد فزوں مرے اندر

رفیق لودھی نے گردشِ حالات، فصیلِ جسم، مقامِ دشت، قیدِ بیاں، چراغِ دروں، لمحۂ بے تابی، خطۂ شاداب اور بارِ ہوس جیسی خوب صورت تشبیہات استعمال کر کے اشعار میں حسن پیدا کیا ہے۔ رفیق لودھی کی زیادہ غزلیں رومانوی ہیں، اس نے ہجر و ہجرت، چراغ، یاد، آنسو، نارسائی، حسرت، ماضی، تنہائی اور اداسی کے الفاظ استعمال کر کے اپنی شدت جذبات کا اظہار کیا ہے۔ رفیق لودھی باکمال شاعر ہے، اس کا شعری مجموعہ ''ترا خیال اور میں'' جدید اُردو غزل میں اہم اضافہ ہے۔

عبدالوحید بسمل اور "ایک پل"

اجمل نذیر

پکارا کریں گے یہ روشن ستارے
ہیں قسمت میں میری کئی ماہ و اختر
خدایا عطا کر مجھے چشمِ بینا
کہ کھل جائیں عقدے اور اسرار مجھ پر

یہ خواہش، یہ تمنا، یہ آرزو جب عبدالوحید بسمل کے لبوں پر مچلتی ہے تو جہانِ تازہ آباد ہوتے ہیں، ہنروری کے عقدے کھلتے ہیں تو شگوفے کھلتے ہیں کہ جن کی تازگی اور مہک کا احساس پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ نُما ہوتا ہے۔ ایسے میں عبدالوحید بسمل کے فکر و فن کو قبولیت کی جِلا ملتی ہے اور مصداق اس قول کے کہ وہ آیا، اس نے دیکھا اور فتح کر لیا، حقیقت کے عین مطابق دکھائی دیتا ہے۔ گو کہ یہاں فتوحات کا سلسلہ خونریزی کے برعکس پیار اور محبت سے عبارت ہے۔ اور یہاں مشقِ سخن کے باعث عبدالوحید بسمل دلوں پر کمندیں ڈالنے کے درپے ہیں تو اُن کی یہ کاوش کامیابی سے ہمکنار نظر آتی ہے۔ یہ کامیابی و کامرانی "ایک پل" میں مسلسل فراز کی طرف محوِ پرواز ہے۔ جب عبدالوحید بسمل ابتدائی حمدیہ کلام میں ہی گویا ہوتے ہیں کہ:

میری سوچ سے بڑھ کر مولا تُو ہے دینے والا
میرے مولا مجھ کو تیری رحمت پر ہے ناز
تیرے ہاتھ میں عزت ذلت رکھنا میری لاج
تُو ہی پالنہار ہے سب کا تُو سب کا دمساز

تو مجھے یوں لگتا ہے کہ عبدالوحید بسمل شاید اپنے فکر و فن کے وہ دیپ فروزاں کیے ہوئے ہیں جن کو قبولیت کی سند عطا ہو رہی ہے۔ اُن کے لیے تکریم و تادیب کے در وا ہو رہے ہیں اور وہ درجہ بہ درجہ عقیدت و وارفتگی کے ساتھ آگے بڑھتے جا رہے ہیں۔ اُن کی عقیدت کا سفر جب مدحتِ خدا سے ہوتا ہوا مدحتِ رسول ﷺ تک پہنچتا ہے تو بھی ان کی عاجزی و انکساری دعائیہ کلمات کا روپ دھارتی ہے اور یوں گویا ہوتی ہے کہ:

دعا یہ میری الٰہی قبول ہو جائے
مجھے سعادتِ نعتِ رسول ﷺ ہو جائے
درِ حضورؐ پہ جو روز و شب گزر جائیں
زمانے بھر کی خوشی کا حصول ہو جائے

تو لگتا ہے زمانے بھر کی خوشی مدحتِ مصطفیٰ کے صدقے ربِ کائنات نے اُن کی جھولی میں ڈال دی۔ ہم سب اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ اُن کا یہ مجموعہ کلام جب زیرِ اشاعت تھا تو عبدالوحید بسمل کو عمرہ کی سعادت عطا ہو گئی اور درِ حضور پہ روز و شب گزارنے کا موقع میسر آیا۔ بظاہر اُن کی معصومانہ خواہش اشعار کی صورت جلوہ گر ہوتی ہے لیکن اس پر قبولیت کی سند اُن کے اخلاص اور وارفتگی کی انتہا کو عیاں کرتی ہے۔ ایک شاعر کے لیے اس سے بڑا کیا اعزاز ہو گا کہ جب وہ کہے:

مری خوشی کا ٹھکانہ کوئی نہ ہو بسمل
یہ حرفِ نعت جو اُن کو قبول ہو جائے

اور اُن کی خوشی کے ٹھکانے کے لیے سفرِ مدینہ کا اہتمام کچھ یوں ہو جائے کہ اُن کے اقوال، افعال کا دامن تھامے عبدالوحید بسمل کو نہال کرتے جائیں۔ ان اقوال اور افعال میں صرف ایک پل کا فاصلہ ہے جو عبدالوحید بسمل نے رب کی عنایت سے طے کیا۔

یہ ایک پل مسلسل ارتقا کا آئینہ دار ہے۔ اس ایک پل میں وہ پوشیدہ راز ہیں جو تفکر کی پوٹلی کو کھولتے ہیں اور لمحہ بہ لمحہ عیاں ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہ راز و نیاز کا سلسلہ قاری کو محوِ سفر رکھتا ہے اور پرت در پرت عبدالوحید بسمل کی جادوگری سے آشنا کرتا ہے۔ جب قاری پہلے پڑاؤ ڈالتا ہے اور سانس لینے کو رکتا ہے تو وہ عبدالوحید بسمل کو ایک ہمدرد، مشفق اور ملنسار کے روپ میں دیکھتا ہے۔ اسے ایک پل سے جو پہلا خزانہ ہاتھ لگتا ہے، اس میں مفید مشورے ہیں جو کہ عبدالوحید بسمل کو معاشرتی زندگی کے مخلص رفیق کی صورت سامنے لاتے ہیں اور وہ کچھ یوں کہتے ہیں:

کدھر کو بتاؤ ہوئے ہو روانہ
چلو اُس طرف جس طرف ہے ٹھکانہ
تمہیں فخر ہے اپنے علم و ہنر پر
ریاکار ہونے سے خود کو بچانا
کبھی مال و زر پر بھروسہ نہ کرنا
کسی کا بھی اپنا نہیں ہے خزانہ

جب قاری کان دھر کر سنتا ہے کہ اس کا جو اپنا ہے وہ بھی اپنا نہیں تو حیرت زدہ ہوتا ہے۔ بسمل اس کی حیرت کو بھانپ کر پھر اس کو حوصلہ دیتے ہیں اور جہانداری کے زریں اصولوں سے آشنا کرتے ہوئے کہتے ہیں:

حصارِ ذات سے نکلو بڑی دلکش فضائیں ہیں
محبت کے اشارے ہیں محبت کی صدائیں ہیں
کسی مجبور کی حاجت روائی کر دعائیں لے
دُکھی دل کی دعاؤں میں خدا کی سب عطائیں ہیں

جب خدا کی عطاؤں کا تذکرہ ہوتا ہے تو جہاں عروج پر فخر و انبساط اور رشک کا لمحۂ تفکر جلوہ نما ہوتا ہے وہاں زوال کی داستاں میں بھی رقم ہوتی ہیں۔ جہاں شادمانی کی ڈنکے بجتے ہیں وہاں دکھ میں آنکھیں بھی چھلکتی ہیں۔ یہ بن بادل برسات تلخیِ حالات کی عکاسی ہے جو ایک پل میں عبدالوحید بسمل کے آزردہ دل کی آہ ہے۔ یہ آہ حالات کی ستم ظریفی پر ایک باشعور شاعر کی چشمِ بینا کا عکس ہے۔ یہ وہ عکس ہے جو آئے روز کسمپرسی کے ساتھ ہمارے سامنے جلوہ گر ہوتا ہے لیکن ہم بے حسی میں آنکھیں موندھے آگے بڑھنے میں عافیت جانتے ہیں۔ لیکن وہ بسمل ہی کیا جو تڑپ محسوس نہ کرے اور تڑپ محسوس کرے تو آسمان سر پر اٹھا کر کچھ یوں اظہار نہ کرے:

تھکاوٹ سے بدن ٹوٹے یہ پچکے گال بچوں کے
صلے میں اپنی محنت کے ہی گزرے سال بچوں کے
کہیں چادر کہیں بستر کہیں کھانا نہیں ملتا
بتاؤں کیا کہ دیکھے میں نے کیا کیا حال بچوں کے
کہیں ہاتھوں میں گیتی ہے کہیں توڑا ہے کاغذ کا
لہو بسمل رُلاتے ہیں یہ خدوخال بچوں کے

ایک اور جگہ ان کی تڑپ انہیں یہ کہنے پر مجبور کرتی ہے کہ:

یہ دردِ ہجر ہے ایسا دوا نہیں ملتی
بدل نہیں کوئی دنیا میں اور ماؤں کا

میں نابلد ہی رہا ہر فریب سے بسملؔ
کہ سیدھا سادھا سا اک آدمی ہوں گاؤں کا

عبدالوحید بسمل کا ایک پل بھی جہانِ تازہ کی نوید ہے۔ یہاں گاؤں کا ایک آدمی قدرت کی صناعی کا اس حد تک گرویدہ ہے کہ دیوانگی کی حد تک رنگوں، پھولوں، جھرنوں، فصلوں اور خوشبوؤں کو متاعِ حیات سمجھے ہوئے ہے۔ جس قدر قدرت کا حسنِ بیاں اس کی آنکھوں کو خیرہ کرتا ہے اسی قدر اس کا جذب و سرور اسے داد و تحسین پر مجبور کرتا ہے۔ ایسی سرمستی میں جب اشعار تخلیق ہوتے ہیں تو اندازِ بیاں بھی سیدھا دل میں گھر کر لیتا ہے۔ دل کی دھڑکنیں منتشر ہوتی ہیں اور زباں خود بخود واہ واہ کی گردان پر مجبور ہو جاتی ہے۔ اگر دل لگتی بات کہوں تو جب دل حسن کی گرفت میں آ جائے تو زباں بے ساختہ وارفتگی سے سرشار ہو کر کچھ یوں گویا ہوتی ہے کہ اظہارِ بیاں عقیدت کے پھول کھلاتا ہے۔ عبدالوحید بسمل نے بھی محبت کے جذبات کو قدرت کی صناعی سے کچھ یوں نتھی کیا ہے کہ ماحول کی دلکشی محبت کے جذبات میں مُقید ہو گئی ہے۔ بسمل کہتے ہیں:

ساری فضا مہک اُٹھی سبزہ و گل کریں سلام
صحنِ چمن کے پھول بھی اُن سے ہوئے ہیں ہم کلام
سارے جہان سے الگ ساری حدوں سے ماورا
تیرا بھی حسن لازوال میرا بھی شوق ناتمام
دیدۂ شوق میں مری اترا اُسی کا عکسِ نور
بزمِ خیال میں مری اس کا ہی ذکر ہے دوام

اور یہی گاؤں کا باسی جب روایات سے جڑ جاتا ہے تو اس کا حسنِ بیاں روایتی رنگوں سے عبارت ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے محبوب کو غیر محسوس انداز میں کچھ یوں مخاطب کرتا ہے کہ:

ایک تو میرا بالم ناچے اس پر باجے ڈھول
بگھی پر لازم میں بھی بولوں بولوں میٹھے بول
ساری سکھیاں دیکھیں مجھ کو کیسے جاؤں پاس
ڈر ہے دل میں پاس گئی تو کھل جائے گا پول
اُجلے کپڑے لنگی ٹوپی اور گلے میں ہار
بن ٹھن کر وہ دولہا آیا سنگ سنگیوں کے غول
وہ کیا جانے میں نہ چاہوں دنیا دولت نام
بسمل میں تو اتنا جانوں آن نبھائے قول

عبدالوحید بسمل کا ایک پل بھی پل پل رُخ موڑتا ہے اور جس طرح زبان کا ذائقہ تبدیل ہوتا ہے ایسے ہی آنکھوں کے سامنے نئے منظر، نئے موسم، نئے رنگ اور نئی سوچیں آن وارد ہوتی ہیں۔ یہی سوچیں ایک باشعور شاعر کو جنم دیتی ہیں۔ جب شاعر کا اظہارِ بیاں قاری کی سوچ کو گرفت میں لے لے تو مفہوم کی گرہیں بڑی سہولت سے کھلتی ہیں۔ گہری سے گہری بات بھی اپنی چھاپ چھوڑتی ہے اور قاری شاعر کا ہم قدم ہو کر آگے بڑھتا ہے۔ یہاں شاعر کی بالغ نظری احساسِ تفاخر پیدا کرتی ہے اور قدر شناسی سے قد کاٹھ اور بڑھ جاتا ہے۔ عبدالوحید بسمل بھی ایک پل میں گہرائی اور گیرائی کے مضامین سمیت جلوہ افروز ہوتے ہیں اور قاری کو اپنی بانہوں میں سمیٹے شعور کی بلندی پر لے جاتے ہیں۔ ایک پل میں اوجِ کمال کے کئی مراتب طے کیے گئے ہیں۔ سند کے لیے شعر ملاحظہ کیجیے:

دیارِ ہجر کی مٹی کو آبِ چشمِ تر دے کر
ہواؤں میں محبت کے محل تعمیر کرتا ہوں

ایک اور مقام پر کچھ یوں گویا ہوتے ہیں:

نعت گو شاعر ''مظفر وارثی''

سعدیہ سیٹھی / برطانیہ

مظفر وارثی 1933ء میں میرٹھ انڈیا میں پیدا ہوئے اور انہوں نے 28 جنوری 2011ء کو لاہور میں وفات پائی۔ وہ اُردو کے نامور شاعر، نقاد، مضامین نگار، نغمہ نگار اور ادیب ہیں۔ آج سے پانچ دہائیاں قبل انہوں نے لکھنے کا آغاز کیا۔ اُن کا بنیادی حوالہ تو بطور نعت گو شاعر ہے۔ مگر انہوں نے ادبی حوالے سے بہت سا تخلیقی کام کیا ہے جس میں غزل نظم کی کتابوں کے علاوہ اُن کی آپ بیتی ''گئے دنوں کے سراغ'' ہے جو کہ ایک نہایت عمدہ تخلیق تسلیم کی جاتی ہے شامل ہے۔ طویل عرصہ تک نوائے وقت اخبار میں ان کا قطعہ شائع ہوتا رہا۔ اگر ہم مظفر وارثی کے خاندانی پس منظر پر نظر ڈالیں تو ان کے والد مظفر الدین صدیقی، الحاج محمد شرف الدین شرفی جو کہ صوفی وارثی کے نام سے شہرت رکھتے ہیں، زمیندار تھے۔ اسلام کے نامور سکالر شاعر اور ڈاکٹر تھے۔ وہ ڈاکٹر علامہ محمد اقبال، عظیم وارثی، حسرت موہانی، جوش ملیح آبادی، احسان دانش، ابوالکلام آزاد اور مہندر سنگھ بیدی کے بھی دوست تھے۔ مظفر وارثی کا خاندان شاندار علمی و ادبی اور اسلامی شان وشوکت کا امین ہے۔

مظفر وارثی کے چچا اسٹیٹ بینک پاکستانی میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر تھے اور ان کے بھتیجے عثمان وارثی معروف گائیک اور موسیقار تھے۔ اُن کا پوتا اکمل قریشی بھی موسیقار، نغمہ نگار اور شاعر ہے۔

مظفر وارثی نے بھی اپنی ملازمت کا آغاز اسٹیٹ بینک آف پاکستان سے کیا۔ مظفر وارثی نے اپنی شاعری کا آغاز فلمی گیت نگاری سے کیا۔ پھر وقت کے ساتھ ساتھ اپنی شاعری کا رُخ بدل لیا۔ بعد میں اللہ اور رسول کی طرف دھیان لگایا اور نظم و غزل کے بعد حمد و نعت لکھنا شروع کی اور ان اصناف میں اپنے مخصوص لب و لہجے، انداز اور ترنم کے باعث بہت شہرت پائی۔ اُن کے مشہور زمانہ نعت ''میرا پیمبر عظیم تر ہے'' بہت باکمال ہے۔

مظفر وارثی کا ادبی کام

الحمد	(حمدیہ مجموعہ)
صبح تاج	(نعتیہ کلام)
لاشریک	(حمدیہ کلام)
اُم القب	(نعتیہ کلام)
کعبہ عشق	(نعتیہ کلام)
گئے دنوں کے سراغ	(آپ بیتی)
نور ازل	(نعتیہ کلام)
برف کی ناؤ	(غزلیات)
باب حرم	(نعتیہ کلام)
کھلے دریچے بند ہوا	(غزلیات)
میرے اچھے رسولؐ	(نعتیہ کلام)
لہجہ	(غزلیات)
دل سے در نبیؐ تک	(نعتیہ کلام)
راکھ کے ڈھیر میں پھول	(غزلیات)
تنہا تنہا گزری ہے۔	(غزلیات)

مظفر وارثی کی مشہور زمانہ غزل:

کیا بھلا مجھ کو پرکھنے کا نتیجہ نکلا
زخم دل آپ کی نظروں سے بھی گہرا نکلا

تجیبت اور لتا نے گائی ہے اور چترا سنگھ نے بھی کئی غزلیں گائی ہیں۔ مشہور زمانہ پاکستانی فلم ''ہمراہی'' جس کے گائے ہوئے گانے آج بھی لوگوں کے دلوں کی دھڑکن ہیں۔ مسعود رانا کی آواز اور مظفر وارثی کے گانے ہر زبان پر اُس وقت تھے:

(۱) کیا کہوں اے دنیا والو کیا ہوں میں
(۲) کرم کی اک نظر ہم پر خدارا یارسول اللہ
(۳) ہوگئی زندگی مجھے پیاری
(۴) نقشہ تیری جدائی کا اب تک نظر میں ہے
(۵) مجھے چھوڑ کر اکیلا کہیں دور جانے والے
(۶) یاد کرتا ہے زمانہ انہی انسانوں کو

اس کے علاوہ بہت ہی مشہور حمد جسے نصرت فتح علی خاں نے گا کر امر کر دیا ''کوئی تو ہے جو نظام ہستی چلا رہا ہے وہی خدا ہے'' عدنان سمیع کی گائی ہوئی حمد ''اے خدا اے خدا'' جس نے کی جستجو مل گیا اُس کو بھی بہت مشہور ہوئی۔

مظفر وارثی نے اپنے جداگانہ اسلوب اور منفرد حمدیہ و نعتیہ شاعری میں بہت نام کمایا۔ وہ جب ترنم سے کلام پڑھتے تو سامعین پر ایک سحر طاری ہو جاتا تھا۔ حمد و نعت کی بدولت انہیں زندگی میں بہت سی کامیابیاں بھی ملیں۔ اس کے علاوہ وہ غزل کے بھی نہایت قادر الکلام شاعر تھے۔ اُن کی غزل کے مضامین اور ردیفیں بہت اچھوتی ہوتی تھیں۔ اگرچہ انہوں نے حمد و نعت میں بہت نام کمایا لیکن اس کی وجہ سے ہم ان کی غزل کو کسی صورت نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اُن کے تین غزلیہ مجموعے شعر و ادب میں اُن کی شناخت مدتوں برقرار رکھیں گے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس عظیم شاعر کے درجات بلند کرے اور جنت الفردوس میں آقائے دو عالم ﷺ کی اُن کو رفاقت نصیب فرمائے۔ آمین

میں جانا لاہور

احمد سعید/فیصل آباد

میں سینکڑوں مرتبہ لاہور جا چکا ہوں، پر اب بھی مجھے لاہور پہنچنا ہو تو میں ''ٹھوکر نیاز بیگ'' تک ہی پہنچ پاتا ہوں۔ باقی کا سفر پوچھتے پوچھاتے ہی طے پاتا ہے۔ لاہو بڑے بھائی کی طرف جانا ہو تو میں اُن کی کالونی سے اگلی یا پچھلی کالونی میں بھٹکتا پھرتا ہوں، پھر امی جان اور بیگم ''جان'' کو بار بار کہتا ہوں کہ پچھلی بار تو گھر یہیں کہیں تھا۔ تھک ہار کر بھائی کو فون ملایا جاتا ہے، وہ اچھی طرح سمجھا بجا کر آخر میں تاریخی جملہ کہتے ہیں کہ یار ادھر ہی رکو، میں خود لینے آتا ہوں۔ وہ فقط لینے ہی نہیں آتے بلکہ جب واپس جانے لگتے ہیں تو کسی ایسی روڈ پر چڑھا کے بھی آتے ہیں، جہاں سے کسی حد تک ٹھوکر نیاز بیگ تک ہم رسائی حاصل کر سکیں۔

آپ یہ نہ سمجھیں کہ ٹھوکر نیاز بیگ کا علاقہ مجھے بالکل یاد ہے، وہ تو موٹر وے سے وہاں اترتے ہیں اور ہم بھی آرام سے اتر جاتے ہیں۔ بس وہاں سے ''نہر و نہر'' ناک کی سیدھ میں جہاں تک سڑک جاتی ہے جا سکتے ہیں، کہیں دائیں یا بائیں مُڑے نہیں تو اب کے ہم مُڑ گئے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں گے۔ لاہور تو لاہور کئی مرتبہ فیصل آباد کے کئی علاقوں میں ذرا دیر سے جانے کا اتفاق ہو تو میں اپنے قریبی شاعروں سے پوچھ رہا ہوتا ہوں کہ یہ یہاں کوئی نیا علاقہ بنا ہے؟ وہ مجھ سے پوچھنے لگتے ہیں کہ تم کہاں رہتے رہے ہو؟ میں بھی ایک مرتبہ شروع سے ہی شروع ہو گیا انھیں بتانے کہ جلندھر اور ہشیار پور۔ کہنے لگے، ''ایدا توں ہشیار رہندا نہیں''۔

بچپن میں ابا جی کے ساتھ لاہور جایا کرتے تھے تھوڑا بڑے ہوئے تو دوستوں کے ساتھ جانا شروع کر دیا۔ اب عرصہ دراز سے فقط بیگم کیساتھ جا رہا ہوں۔ لاہور میں بڑے بھائی، چچا جان، بہت سے دوست اور تو اور بیگم کی بہن تک وہاں موجود ہے۔

لاہور کی بہت ہی خوبصورت یادیں ہیں ان میں سے ایک خوبصورت یاد آپ کو بتاتا، لیکن ابھی وہ یاد نہیں آ رہی، آپ کو یاد آئے تو مجھے ضرور بتائیے گا۔

۲۰۱۵ میں لاہور سے میری کتاب ''بلاوجہ'' چھپ رہی تھی تو مجھے لاہور بار بار جانے کا اتفاق ہوا، جس سے لاہور کے بہت سے راستے مجھے زبانی یاد ہو گئے (اُن راستوں کے فقط نام ہی زبانی یاد ہوئے ہیں)۔ انہی دنوں کی بات ہے کہ مجھے ایک دن سخت بھوک لگی، ویسے جتنے دن بھی کتاب کے سلسلے میں لاہور آیا، سخت بھوک ہی لگی۔ لیکن باقی دنوں میں کوئی یار سجن ہتھے چڑھ جاتا تھا، پر اس دن تو اپنے ہی ''پلے'' سے کھانا پڑا۔ میں نے فیصل آباد ایک دوست کو فون کیا جو اُردو بازار آتا رہتا ہے۔ اُس سے کہا، یار کھانا کہاں سے اچھا ملے گا اُردو بازار میں۔ کہنے لگا کہ مجھے تو یہاں قریب جنگی بریانی پسند ہے۔ میں تو پہلے بریانی کا نام سُن کر ہی گھبرا گیا، خیر کسی سے پوچھا کہ پیدل جایا جا سکتا ہے؟ وہ بھائی صاحب کہنے لگے کہ کیا کہہ رہے ہیں؟ کوئی رکشہ وغیرہ لے لیں۔ رکشے والے سے پوچھا۔ وہ کہنے لگا کہ سو روپے لوں گا۔ دل نے کہا، پہلے رکشے والے کو سو، پھر بریانی والے کو دو سو، واپسی پہ رکشے والے کو پھر سو۔ بریانی واقعی جنگی لگ رہی تھی۔ میں نے بھی ہوا میں تیر چلایا کہ یہ ساتھ تو ہے۔ رکشہ والا یہ بات سُن کر ہکا بکا رہ گیا۔ میں اس کی یہ حالت دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا، مجھے لگا کہ ''رکشے میں کچھ کالا ہے''۔ میں نے اردگرد کوئی سُلجھا ہوا شخص ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ ایک شخص نے بتایا کہ بالکل ساتھ ہی ہے، پیدل پانچ سات منٹ لگیں گے۔ میں پیدل دس منٹ کے اندر اندر جنگی بریانی پہنچ گیا، اور جنگ و جنگی ہو پڑا بریانی پر۔ لاہور میں اکثر بریانی پائے نہاری کی دکانوں پہ ریٹ لسٹ نہیں لگی ہوتی، پھر کسی دوسرے شہر سے آیا ہوا شخص اُن کھانوں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے، یعنی کھانوں کا بل جب سامنے آتا ہے تو اُس کے طوطے ہی نہیں سارے پیسے بھی اُڑ جاتے ہیں، پھر اُس شخص کو انور مسعود کا یہ شعر یاد آتا ہو گا کہ

روٹی شوٹی کھا بیٹھے
آں سوچی پئے آں ہن کی کریے

اب آپ یہ مت سمجھیں کہ میرے ساتھ بھی جنگی بریانی پہ ایسا ہی کچھ ہوا ہو گا۔ یقین کریں کہ انھوں نے تو بریانی کے بعد تھوڑا سا زردہ بھی دیا، زیادہ دیتے تو پوری تحریر ہی اُن پہ لکھ دیتا۔

شاعری

دل سے فرقت کی وہ روداد نہیں جاتی ہے
جان جاتی ہے مگر یاد نہیں جاتی ہے
جانے اس شخص کا غم ہم سے جدا کب ہوگا
جانے کیوں صحبت ہم زاد نہیں جاتی ہے
ہم مسافت کے اسالیب کہاں سے لائیں
راہ کی رنجش افتاد نہیں جاتی ہے
زیست جتنی بھی زمینوں سے سویرے لائے
شام ویرانی بغداد نہیں جاتی ہے
اس سماعت کے دریچے جو نہیں ہیں کھلتے
التجائے دل برباد نہیں جاتی ہے
ہم عقیدت ہی کے اسباب یہاں رکھتے ہیں
گھر سے رونق میلاد نہیں جاتی ہے
ہم نے الفاظ کی منت تو بہت کی ثاقب
لب پہ ٹھہری ہوئی فریاد نہیں جاتی ہے

آصف ثاقب/ہزارہ

زخم کی پھول میں شباہت ہے
یہ ترے ہاتھ کی کرامت ہے
دل کا آئینہ صاف کر کے دیکھ
آدمی کتنا خوبصورت ہے
قلت آب کو نہ بڑھنے دو
پیاس کی کربلا سے نسبت ہے
پھول ہے پتیوں کے دم سے پھول
کیسی وحدت مآب کثرت ہے

اس کا مطلب غلط نہ لینا مجھے
غور سے دیکھنے کی عادت ہے
آؤ مل کر کریں شجرکاری
دھوپ میں بے پناہ شدت ہے
مسکرا کر ملا کریں سب سے
یہ بھی اک طرح کی سخاوت ہے
شعر سننا تو اب ہے نصرت
شعر کہنا اگر عبادت ہے

نصرت صدیقی/فیصل آباد

شیشہ گر کیسے شیشہ گری چھوڑ دیں
ہم بھی کیسے تری دلبری چھوڑ دیں
بوسہ لینے میں رہتی ہے اکثر جھجک
تم کہو تو یہ عادت ابھی چھوڑ دیں
ہم سے کہتے ہیں ترک محبت کا آپ
صاف کہیے کہ ہم زندگی چھوڑ دیں
اس کی کو منانے میں گم سم رہوں
مجھ میں آپ اپنی ایسی کمی چھوڑ دیں
دیکھنا رونقیں ماند پڑ جائیں گی
ہم جو تیری گلی واقعی چھوڑ دیں
ڈائری میں لکھیں عشقیہ شاعری
پھر ترے گھر وہی ڈائری چھوڑ دیں
اہل دل عشق میں ایسے نادان ہیں
عاشقی کے لیے خواجگی چھوڑ دیں
دیر تک دل کی حالت سنبھلتی نہیں
جب بھی آنکھوں میں یادیں نمی چھوڑ دیں

آپ کے بس کی یہ بات ہرگز نہیں
"پونچھ لیں چشم تر، عاشقی چھوڑ دیں"
ہم بھی راشد بدلتے ہیں اپنا مزاج
آپ بھی تو ذرا برہمی چھوڑ دیں

ممتاز راشد لاہوری/لاہور

چاہے جیسے بھی حال میں رکھے
اس سے کہنا خیال میں رکھے
تا کہ میں لاجواب ہو جاؤں
بیچ و خم ہیں سوال میں رکھے
اس کو خالق نے جب کیا تخلیق
جلوے کیا کیا جمال میں رکھے
عشق ہے ایسا سرمدی نغمہ
ہر گھڑی جو دھمال میں رکھے
مدتوں سے خزاں رسیدہ ہوں
اب تو باد شمال میں رکھے
ہر نشیمن کی سمت دیکھتے ہیں
سانپے ڈال ڈال میں رکھے
جو بھی ڈھانا ہے اب ستم ڈھائے
کس لیے احتمال میں رکھے
ہو چکا ہوں بہت نظرانداز
اب ذرا دیکھ بھال میں رکھے
دل نوازی و دلربائی کے
ہیں ستم خدوخال میں رکھے
اس کی مرضی ہے اب جلیل ہمیں
ہجر دے یا وصال میں رکھے

احمد جلیل/اوکاڑہ

(افسانہ)

تم زندہ رہو گے

مصطفیٰ کریم

لندن سے دو سو پچپن میل دور اسکاربرو نور جہاں صرف مسلمہ سے ملنے نہیں آئی تھی۔ وہ عارفہ سے بھی ملنا چاہتی تھی۔ جس سے ملاقات انگلستان میں ہوئی اور پھر عجیب سی قربت ہوگئی۔ حالانکہ صوبہ بہار کے شہر عظیم آباد کی رہنے والی عارفہ بنگلہ نہیں جانتی تھی لیکن انگریزی میں باتیں کر کے دونوں ایک دوسرے کی باتیں سمجھ لیتی تھیں۔ نور جہاں اور بچپن کی دوست مسلمہ ڈھاکہ کی رہنے والی تھیں۔ نور جہاں کے خاوند کی وفات کو ایک سال ہو رہا تھا۔ گھر کی تنہائی سے وہ تنگ آ گئی۔ بیٹے نے مشورہ دیا کہ باہر نکلو رشتہ داروں اور دوستوں سے ملو۔ پہلی بار جب گھر سے نکلی تو بنگلہ دیش گئی اور واپس انگلستان آنے کے بعد مسلمہ کے بلانے پر اسکاربرو چند دنوں کے لیے آ گئی۔ عارفہ کو پسند کرنے کی وجہ اس کا انتہائی مذہبی ہونا اور ساتھ ہی دنیا کے ہولناک مسائل میں دلچسپی لینا بھی تھا۔ وہ یورپ میں اسلام کے خلاف تیز بڑھتی ہوئی نفرت اور بیگانگی سے واقف تھی اور نجی گفتگو میں بار بار کہتی تھی کہ اس کے خلاف موثر جنگ مسلمان بہتر انسان بن کر اور یورپین معاشی اور سیاسی بدعنوانیوں کے خلاف جدوجہد میں حصہ لے کر کر سکتے ہیں۔ عارفہ اس سوچ پر عمل بھی کرتی تھی۔ ماحول کو ترقی یافتہ ممالک جس طرح تباہ کر رہے تھے اس کے خلاف جب لندن میں احتجاجی جلوس نکلا تو اس میں عارفہ اور اس کے خاوند صغیر بھی شریک تھے۔ اس وقت چند لمحوں کے لیے نور جہاں کو خیال آیا تھا کہ سابق مشرقی پاکستان میں جب پاکستانی فوج سفاکیاں کر رہی تھی تو کیا یہ دونوں میاں بیوی کسی احتجاجی جلوس میں شریک تھے؟ اور ایسا سوچنا درست ہی تھا۔ نور جہاں کی بہن اسی سفاکی کی شکار ہوئی تھی۔ پھر بھی چند سال کے بعد جب عارفہ کے گھر میں عید میلاد النبی منائی گئی تو نور جہاں کا خاوند شیریں قرات میں درود پڑھنے اور نبی کی زندگی پر مختصر تقریر کرنے آیا تھا۔

یہ سب پرانی باتیں تھیں۔ لیکن نور جہاں انہیں نہیں بھولی تھی۔ وہ سدابہار پھولوں کی طرح اس کے ذہن میں مہکتی رہتی تھیں۔ چونکہ ان یادوں میں اس کا خاوند بھی شریک تھا۔ جس صبح وہ اسکاربرو پہنچی اسی دن ایک بجے سے پہلے عارفہ، مسلمہ کے گھر آ گئی۔ وہ نور جہاں سے خوب گرم جوشی سے گلے ملی۔ عارفہ نے نور جہاں اور مسلمہ کو اپنے گھر دوپہر کے وقت مدعو کیا۔ مسلمہ نے معذرت کر لی۔ چونکہ اسے ہسپتال فزیو تھیراپی (Physiotherapy) کے لیے جانا تھا۔ نور جہاں کو عارفہ اپنے گھر لے آئی۔ کچھ دیر بعد چند عرب، افریقن اور پاکستانی خواتین آ گئیں۔ سبھوں نے قرآن مجید سنبھالا ہوا تھا۔ علیک سلیک ہوئی۔ عارفہ نے نور جہاں کا تعارف کرایا اور بتایا کہ ہفتہ میں ایک دن باری باری کسی ایک کے گھر میں جمع ہو کر قرآن خوانی ہوتی ہے، آیتوں کے معنی سمجھے اور سمجھائے جاتے ہیں۔ کچھ دیر بعد قرآن خوانی شروع ہو گئی۔

اوپر کے ایک کمرے میں عارفہ کا خاوند صغیر کرسی پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ قرآن خوانی اسے شہد کی مکھیوں کی گنگناہٹ لگی۔ وہ مذہبی انسان نہیں تھا۔ اس کے علاوہ خواتین کے اجتماع میں کوئی مرد نہیں تھا۔ اس لیے نیچے جانے کی ضرورت اس نے محسوس نہیں کی۔ یہ بھی سچ تھا کہ مسلمان مرد حضرات کم ہی ایک دوسرے سے ملتے تھے۔ ان میں زیادہ تعداد عربوں کی تھی وہ عربی میں گفتگو کرتے۔ جس کا سمجھنا پاکستانی اور ہندوستانی مسلمانوں کے لیے مشکل تھا۔ اس کے علاوہ یہ بھی خطرہ رہتا تھا کہ کہیں بات چیت میں فلسطین کا ذکر اس طرح نہ آ جائے کہ کسی کو دہشت گردی کا گمان ہونے لگے۔ کچھ دیر بعد شہد کی مکھیوں جیسی گنگناہٹ بند ہو گئی۔ تھوڑی دیر خاموشی رہی اس کے بعد خواتین کا ہنسنا اور بولنا سنائی دیا۔ پھر باہر جانے والے دروازے کے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں آئیں۔ جب خواتین چلی گئیں تو گھر میں خاموشی چھا گئی۔ وہی سنگین خاموشی جو کبھی کبھی پریشان کن ہو جاتی تھی۔ بچے بڑے ہو کر گھر سے جا چکے تھے اور اپنے ساتھ گھر کی چہل پہل بھی لے گئے۔

''نیچے آئیے یہاں۔'' عارفہ کی لاؤنج سے پکارنے کی آواز آئی۔

صغیر آہستہ سے کرسی سے اٹھا۔ ''ضعیفی بوجھ ہے۔'' وہ زیر لب بولا اور سیڑھیوں سے اتر کر لاؤنج میں گیا۔ نور جہاں کو دیکھ کر وہ چونکا۔ اسے دیکھ کر ایک اداس مسکراہٹ نور جہاں کے لبوں پر آ گئی اور اس نے ہاتھ اٹھا کر اسلام علیکم کہا۔ مدت ہوئی اس کا خاوند باسط اور صغیر ڈھاکہ یونیورسٹی میں ساتھ پڑھتے تھے۔ وہاں سے تعلیم ختم کرنے کے بعد صغیر لیڈز یونیورسٹی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے آیا اور ڈگری حاصل کرنے کے بعد لیڈز کے قریب ساحلی شہر اور اسکاربرو میں ملازمت لینے کے بعد وہیں بس گیا۔ باسط بیرسٹری کرنے لندن آیا اور پھر ایک بڑی فرم میں بیرسٹر کی حیثیت سے کام کرنے لگا۔ دونوں کی کبھی کبھی

افسانہ

خالد محمود قریشی/گوجر خاں

اس کے ہاتھوں کی دونوں انگلیاں اس کی آنکھوں کو آہستگی سے مساج کر رہی تھیں وہ ابھی حالت خوابیدگی کو توڑنا نہیں چاہتا تھا اس کے لاشعور میں اور متوقع منظر میں جو اسے حقیقت کی دنیا میں واپس آنے پر دکھائی دینے والا تھا ایک کشمکش چل رہی تھی۔ آخر کار اس نے آنکھیں کھولیں اس کا شعور اس کے لاشعور کو شکست دے چکا تھا منظر سامنے تھا وہ اپنے کمرے کے بیڈ پر لیٹا تھا۔ خواب کا منظر ختم ہو چکا تھا ایک زمانہ لمحوں میں بیت چکا تھا۔ وہ یہ لمحے ہاتھ سے کھو جانے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا اس نے زبردستی آنکھیں موند لیں وہ دوبارہ وہی مناظر دیکھ رہا تھا۔ بازار میں بہت رش ہے چھٹی کا دن ہے اس کے ہاتھ میں ایک لمبی لسٹ ہے جیب میں تنخواہ کا ایک حصہ موجود ہے وہ ایک سے دوسری دوکان میں جا رہا ہے اس کا تھیلا بھرتا جا رہا ہے۔ دوکان سے باہر آنے پر اسے فقیر گھیر تے ہیں وہ ہر چہرے پر نظر ڈال کر درست اندازہ لگانے کی کوشش کرتا ہے ایک لمحے میں اپنے رائے درست قائم کرنے پر مطمئن ہونے کی کوشش کرتا ہے ضمیر میں ایک خلش محسوس ہوتی ہے اسے جھٹکتا ہے آگے بڑھتا ہے۔ ایک فلاحی ورکر سے سامنا ہونے پر اسے مصافحہ کرنا پڑتا ہے۔ پھر فقیر گھیر تے ہیں وہ اپنے ضمیر کا بوجھ ہلکا کرنے میں ایک ناکام سی زبانی کوشش کرتا ہے دیکھیں جی معاشرہ کیسے ٹھیک ہو سکتا ہے جب تک یہ لوگ مفت خوری نہیں چھوڑیں گے۔ یہ پیشہ ور لوگ ہیں نشہ کرتے ہیں بدکاری کرتے ہیں۔ ڈھونگ رچا رکھا ہے غربت کا کوئی کہتا ہے مسافر ہوں جیب کٹ گئی ہے۔ کوئی کہتا ہے دو دن سے بھوکا ہوں مزدوری نہیں ملی۔ کوئی کہتا ہے معذور ہوں کوئی کہتا ہے بیمار ہوں کوئی کہتا ہے ماں کا آپریشن کروانا ہے کوئی کہتا ہے ملنگ ہوں ایسی دعا دوں تمہارے وارے نیارے ہو جائیں گے۔ کوئی کہتا ہے فلاں کی نیاز دینی ہے مگر شرط ہے مانگ کر دینی ہے یہ سب نکھٹو اور کام چور ہیں انہیں مفت خوری کا چسکا پڑ چکا ہے۔ پتہ نہیں انہیں ہماری حکومت پکڑتی کیوں نہیں۔ انہیں جیلوں میں کیوں نہیں ڈالتی اچھا اجازت دیں گرمی سخت ہے پھر کبھی گپ شپ ہوگی۔ دل میں سوچتا ہے کہ جان چھڑ واؤ؟ اس کہیں یہ چندے کی رسید ہی نہ نکال لے۔ جیب ہلکی ہو چکی وہ گھر آ کر کھانا کھاتا ہے اور ٹی وی آن کر کے محو فراش ہو جاتا ہے اس سے آگے اس کا شعور اسے کچھ دکھانے سے قاصر ہے وہ لاشعور کے ہاتھوں شکست کھا جاتا ہے اب وہ لاشعور کی ناؤ میں ہچکولے کھانے لگتا ہے خیال کی لہریں حقیقت کا روپ دھارتی ہیں وہ ایک خوبصورت جزیرے پر ہے پہاڑ کے دامن میں گنگناتی ندی کے کنارے پاؤں پانی میں ڈالے ڈوبنے والے سورج کی کرنیں اس کے پاؤں کے ساتھ ہی پانی میں اپنا عکس چھوڑتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اسی کیفیت ڈوبے ہوئے اسے ارتعاش محسوس ہوتا ہے اور آناً فاناً وہ ندی کی لہروں میں غوطے کھانے لگتا ہے اس کے ہاتھ پاؤں شل ہو جاتے ہیں وہ اپنے آپ کو لہروں کے حوالے کرنے پر راضی کرنے کی کوششیں کرتا ہے اندھیرا اس کی آنکھوں سے دماغ میں اترتا ہے۔ اور پھر روشنی میں تبدیل ہو جاتا ہے ہاتھ پاؤں پر گرفت سی محسوس ہوتی ہے وہ فوراً آنکھیں کھولتا ہے غیر متوقع منظر دیکھتا ہے عجیب نامانوس سی آوازیں، اجنبی چہرے دکھائی دیتے ہیں۔ اسے بتایا جاتا ہے کہ وہ ایک غیر ملکی جیل میں آ پہنچا ہے، جیل ایک ایسے ملک میں جہاں کپڑے اور جوتے رہائشی سرپرستی میں تیار کروائے جاتے ہیں جیل میں اس مشقت کا معاوضہ قیدیوں کے ورثاء کو دیا جاتا ہے جبکہ جوتے اور کپڑے کی فیکٹریاں ہی اصل میں جیل ہوتی ہیں کوئی ریاست کے علاوہ یہ کاروبار نہیں کر سکتا۔ بے مثال خوشحالی کی وجہ پوری دنیا میں اس ملک کے جوتے اور کپڑے کی برآمدات سستی اجرت اور ڈسپلن کے باعث ہے۔

فروغ ادب کے لیے وقف

براہ کرم اپنی اردو اور انگریزی تخلیقات (شاعری ونثر) کمپوز کروا کے "ان پیج" میں ای میل کر دیا کریں
bookdigest@hotmail.com

آپ اپنے مضامین بذریعہ ڈاک بھی ارسال کر سکتے ہیں۔ رسالے کے حصول کے لیے سالانہ زرتعاون مبلغ -/1000 روپے اپنے ڈاک کے پتے اور موبائل نمبر کے ساتھ بذریعہ منی آرڈر بنام مظہر سلیم مجوکہ مدیر اعلیٰ ماہنامہ بک ڈائجسٹ، کتاب ورثہ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور کو ارسال کریں۔ رسالہ آپ کو باقاعدگی سے ملتا رہے گا۔

برائے خط و کتابت/ ترسیل زر/ رابطہ

بک ڈائجسٹ
کتاب ورثہ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور
0333-4377794 - 042-37322996

بہ یاد: سید قاسم محمود
Monthly Book Digest
بک ڈائجسٹ لاہور
ISSN 2079-4584
bookdigest@hotmail.com
kitabvirsa@gmail.com
مدیر اعلیٰ: مظہر سلیم مجوکہ
مدیر اعزازی: اظہر سلیم مجوکہ

صوبہ پنجاب کے تمام کالجوں اور پبلک لائبریریوں کے لیے منظور شدہ

تیری میری چاہت

حمیرا تبسم

وہ خفگی سے چہرہ جھکائے صوفے پر اداس بیٹھی تھی دل میں انا کی جنگ جاری تھی۔اس کی نیلی آنکھوں میں نمی ستارہ بن کر چمک رہی تھی۔گلابی لبوں پہ خاموشی کا قفل پڑا تھا جبکہ ماتھے پہ سلوٹیں نمودار تھیں۔ہر سلوٹ میں ایک شکوہ پنہاں تھا۔

عدیل کھڑکی کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھا گاہے بگاہے اس پر نظر ڈالنا نہ بھولتا۔سردیوں کی سنہری دھوپ کھڑکی کی درز میں سے چھن کر آتی ہوئی کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔

''میں اب تمہارے ساتھ نہیں رہنا چاہتی''

کمرے کی اداس بھری فضا میں اس کی آواز گونجی تو عدیل کے دل میں چھناکے سے کچھ ٹوٹا۔عدیل نے گردن ترچھی کرکے اس پر منت بھری نگاہ ڈالی اور بے چین ہو گیا وہ کسی بھی قیمت پہ گھر نہیں توڑنا چاہتا تھا اس کی زندگی میں رشتوں کی بہت اہمیت تھی جبکہ نیلم زرا سی بات پر انا پہ اڑی رشتہ توڑنے کو بضد تھی اور وہ سدا کا جذباتی شخص اپنی ہار تسلیم کیے پچھتاوے کی آنچ میں سلگ رہا تھا۔وہ اسے پیار سے سمجھانا چاہتا تھا لیکن سب الٹ ہو گیا اور ان دونوں کے درمیان تناؤ کی دیوار تن گئی۔

کچھ دیر پہلے نیلم اپنی ماں کے گھر جانے کی تیاری کر رہی تھی

جب اس نے کہا کہ وہاں ابھی مت جاؤ۔۔میری امی گھر آ رہی ہیں تو وہ چلا اٹھی۔

''تمہاری امی آ رہی ہیں تو میں کیا کروں،تم ہو نا سنبھالنے کے لیے؟''

عدیل اس کی بات سن کر غم و غصے میں ڈوب گیا لیکن پھر بھی خود کو سنبھالتے ہوئے نرمی سے گویا ہوا۔

''دیکھو نیلم،میری امی جب لوٹ جائیں گی تب تم چلی جانا اور جتنے دن چاہے مرضی رہ لینا''

بیگ کی زپ بند کرتی نیلم نے طنزیہ مسکراہٹ چہرے پر سجائی اور سردمہری سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''میں آج ہی میکے جاؤں گی،تم مجھے روک کر دکھاؤ''

اس کی ہٹ دھرمی دیکھ کر عدیل کے دل میں غم و غصے کی شدید لہر جاگ اٹھی اس نے سوچا بھی نہ تھا کہ نیلم اتنی کٹھور بن جائے گی۔

''ٹھیک ہے تم جاؤ میکے لیکن واپس مت آنا۔''دھمکی آمیز لہجے میں بات مکمل کرنے کے بعد وہ کھڑکی کے پاس رکھی کرسی پہ جا بیٹھا جبکہ نیلم تاسف بھری نگاہ اس پہ ڈالتے ہوئے صوفے پہ ٹک گئی۔

''میں کبھی لوٹ کر نہیں آؤں گی''نیلم کی آواز نے پھر سے خاموشی میں دراڑ ڈالی تو عدیل نے اس بار تڑپ کر اسکی جانب دیکھا۔اب وہ بیگ اٹھائے جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔وہ جلدی سے اٹھ کر اس کے قریب آیا۔

''محبت بھلا دی تم نے؟تمہاری چاہت میری چاہت ہوگی۔۔تمہارے الفاظ تھے نا؟''عدیل نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''لیکن چاہت صرف تمہاری بدلی عدیل جہانزیب،تم نے اپنی ماں کی خاطر مجھے اذیت دی''

نیلم بھیگے لہجے میں بولی۔

اچانک آسمان پہ در آنیوالے بادل گرجے تو بارش برسنے لگی اور بوندیں کھڑکی سے ٹکرا کر پانی کی لکیر بنتے ہوئے پھسلنے لگیں۔کھڑکی سے باہر کا منظر دھندلا مکمل طور پہ دھندلا گیا۔

معاف کردو ہمیشہ کی طرح،ہماری چاہت ایک ہو سکتی ہے تو ہماری مائیں کیوں نہیں''عدیل نے اب اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے اور مان سے بولا۔۔

ٹپ ٹپ ٹپ۔۔۔۔۔۔۔برستی بارش کی بوندوں کی آواز کے ساتھ نیلم کا دل بھی دھڑک اٹھا۔محبت خودغرضی نہیں بلکہ احساس کا نام ہے وہ سمجھ گئی۔

''امی کے لیے کھانے میں کیا بناؤں؟''

جب وہ بولی تو عدیل پورے من سے مسکرایا۔چاہتوں کا رنگ بارش کے ساتھ برسنے لگا۔محبت مسکرا اٹھی جبکہ اداسی نے الوداع کہہ دیا اور چہار سو محبتوں کے پھول کھل اٹھے۔

سرپرست

ناہید وحید/کراچی

"ارے میں لٹ گیا۔ گھر اجڑ گیا میرا۔ کیسا ظلم ہو گیا۔۔۔ میری عابدہ مجھے چھوڑ گ ء مار دیا ظالم نے۔۔ ایسا چھرا مارا۔ سب لے گیا چھین کے۔۔ اب کیا ہو گا؟"

نعیم نے مصنوعی بناوٹی انداز سے چیخ چیخ کر دہاہ دی۔۔

لیکن محلے داروں میں سے کسی نے نہ تو اسکی بات سننے کے لئے سر اٹھایا نہ اسکے گرمچھ کے آنسوؤں سے متوجہ ہوئے۔ کسی نے دلاسا تک نہ دیا۔۔ سب ٹوپی لگائے بت بنے میلی کچیلی سی دری پہ افسردہ بیٹھے مرنے والی پہ کف افسوس بھر رہے تھے۔

"دیکھو تو کیسا رونا ڈالا ہوا ہے جیسے خود تو اسے پھولوں کی طرح رکھتا تھا"۔

"بیچاری روز مار کھاتی تھی۔ اور اب ٹسوے دیکھو"۔

کسی محلے دار کی آواز ابھری "ہاں بھئی!! کیا ظلم ہے رات بھر بیچاری گھر کے دروازے پہ پڑی رہی"

کسی طرف سے دوسرے محلے دار نے اپنے قریب بیٹھے شخص کے کان میں سرگوشی کی۔

کچھ اور چہ مہ گوئیاں شروع ہوئیں۔۔۔

"جب سے اس نے نشہ کرنا شروع کیا سمجھو سب ڈوب گیا۔۔ بس اللہ سب کو محفوظ رکھے"

لیکن ہوا کیا تھا؟ اس ہیروئنچی کی بات کا کیا اعتبار۔ اول فول بک رہا ہے""

کسی نے با آواز بلند کہا۔۔

"پولیس کیس ہے، قتل ہوا ہے۔ میں تو کہتا ہوں پولیس کو خبر کرو وہی سچ اگلوائے گی اس نش ء سے"

نعیم نے پولیس کا نام سنتے ہی رونا دھونا بند کیا۔۔

ویسے تو اسے نش ء کا لفظ سنتے ہی طیش چڑھ جاتا تھا۔ جیسے وہ نش ء نہ ہو بلکہ کوء اور اسپر اپنا الزام دھرتا ہو۔۔۔ لیکن اسوقت پولیس کا نام سنکر اسکا رہا سہا نشہ بھی ٹوٹ گیا۔۔

نشہ ٹوٹنے کی اس کیفیت میں اگر اسکے سامنے اسوقت جیتی جاگتی عابدہ ہوتی تو خوب پٹتی۔ اسوقت تک گالیاں کھاتی رہتی جب تک نعیم کی زبان نہ تھکتی۔ اور پھر مار پیٹ لڑاء جھگڑا شروع ہوتا جو اس وقت تک جاری رہتا جب تک نعیم کے ہاتھ پیسے نہ لگ جاتے یا وہ نشہ نہ کر لیتا۔ یہ اسکا کم و بیش روز کا قصہ تھا۔

نعیم کے ساتھ عابدہ کی زندگی بس یہی رہ گی تھی۔۔ اسوقت بھی نعیم بہت بپھر گیا

"پولیس۔۔ مجھ سے۔ مجھ سے کیوں پوچھے گی۔۔ وہ کیوں آئے گی۔ اے۔۔ کچھ تو شرم کرو۔ حیا کرو۔۔

یہ کام پہلوان کے بیٹے کا ہے اور کون ہے اس محلے میں غنڈہ بدمعاش۔ بتاؤ؟۔ وہی سارے روپے بھی چھین کر لے گیا"۔۔

سچی یا جھوٹی گھڑتے ہوئے نعیم کھسیانا سا ہو کر رہ گیا۔ پھر بولا

"اسکے علاوہ اور کون چھرا گھونپے گا۔ میں رنڈوا ہو گیا۔ میرے بچے تو ماں کی ممتا کو ترسینگے۔ موت آء تھی مرگ ء۔ مجھے تو گھر سے نکال دیا تھا۔

صبح دروازے پہ مری پڑی تھی۔۔۔ میں نے صبر کر لیا۔ ان بچوں کو کون سمجھائے گا کون سنبھالے گا"۔

محلے والوں کے کان نہ دھرنے پہ طیش میں منہ ہی منہ میں بڑبڑا کے رہ گیا

"ہو گی کسی یار کے ساتھ"۔

نعیم کی کہانی من گھڑت سہی لیکن عابدہ کی موت ایک بھیانک حقیقت تھی۔

محلے والے چاہ کر بھی اس بھیانک حقیقت سے خود کو الگ نہیں کر پا رہے تھے۔

سو اس نش ء سے بھی الجھ گئے۔

"یہ تو تمھارے سوچنے کی بات تھی۔ اب بھی وقت ہے علاج کرواؤ اپنا۔ نشہ چھوڑ دو تو محلے والے تمھارا ساتھ دیں گے نعیم بھاء۔ اپنے بچوں کا سوچو اب عابدہ بھابھی بھی نہیں رہی بیچاری کسی طرح پال پوس رہی تھی"۔

نعیم نے عجیب انداز سے سر کھجانا شروع کر دیا۔

"ورنہ تمھیں پولیس کو دے دیں گے محلے والے"

کسی نے پھر پولیس کا ڈراوا دیا۔۔

"تم تو میرے بچوں کو بلکل لاوارث کرنا چاہتے ہو۔ نشہ کرتا ہوں اپنے پیسے سے کرتا ہوں

تمھاری کیا دشمنی ہے مجھ سے۔ جو میرے بچوں کو باپ کی شفقت سے محروم کرنا چاہتے ہو"

"باپ کی شفقت ہونہہ۔۔

اپنے نشے کی لت پوری کرنے کو تم نے کتنی بار اپنے بچوں کو بھیک مانگنے کے لئے چوراہے پہ کھڑا کیا ہے۔ تمھاری یہی گھناؤنی حرکت ان سے برداشت نہیں ہوئی اسی لئے عابدہ بہن اب تم کو گھر میں گھسنے نہیں دے رہی تھی۔"

ایک پڑوسی نے نفرت سے کہا

"یہ کب کیا اس نے؟ عابدہ بہن تو بھیک مانگنے کو لعنت سمجھتی تھی، یاد نہیں جب یہ خود بھیک مانگ کر نشہ کرنے لگا تھا تو عابدہ بہن ایک ایک کے گھر جا کر روئی تھی اس سے قطع تعلق کرنے کی بات کی تھی۔ کاش اس وقت ہم نے بیچاری کی بات سمجھی ہوتی اسکی

مجبوری بھی ہوتی"
ایک اور پڑوسی نے دکھ اور پشیمانی سے کہا۔
"بھاء اب یہ پچھلے تین چار دن سے بچوں کو بھیک منگوانے لے جاتا رہا ہے۔
عابدہ بہن دن میں ہوتی نہیں تھی رات میں یہ گھر سے غائب۔ محلے والوں نے عابدہ بہن
کو خبر کردی۔ تب سے اس نے ٹھان لی تھی کہ اب اس کو گھر میں گھسنے نہیں دے گی"
پڑوسی نے بات جاری رکھتے ہوئے تازہ ترین معلومات فراہم کیں
"عابدہ بہن کو یہ کام بہت دن کے بعد ملا تھا۔ اسکا نشہ پورا نہیں ہو رہا ہوگا نا تو یوں کیا اس نے۔
نا معلوم کون لوگ یوں کھلے عام موت بیچتے پھر رہے ہیں،
نشہ کرنے والے مریں یا نہ مریں لیکن انکے گھر والے بیوی بچے زندہ درگور ہو جاتے ہیں
جیتے جی مر جاتے ہیں"
"ہاں بھئی۔"
دوسرے نے ہاں میں ہاں ملاء۔
" ہاں میرے مرنے کی دعا مانگو۔۔ کہہ رہا ہوں رات گھر آ گیا تھا۔ توبہ کرلی تھی
میں نے اب نشہ نہیں کرونگا۔ لیکن نکال دیا منحوس نے۔ سرپرست ہوں
کتنی خود مختار ہو گئی تھی۔ کوء یہ نہیں دیکھ رہا۔ سب چلے ہمدرد بننے"
نعیم نے اپنے بچے کچے حواس سے بات کرنے کی کوشش کی۔
محلے داروں میں سے ایک زچ ہو کر بولا
"تم نے صبح آ کر خبر دی نشے کے بعد تو تم کو ہوش بھی نہیں ہوتا کئی کئی دن سوئے پڑے رہتے ہو۔ چار دن سے رات میں گھر نہیں آ رہے تھے۔
کل پیسے اٹھانے آئے تھے نا۔۔۔!!! سات آٹھ سال سے تم کو نشہ کرتے دیکھ رہے ہیں
سب جانتے ہیں تم کیا کیا کرتے ہو۔ سارا محلہ گواہ ہے۔ تم کیا کیا کر سکتے ہو سب کو پتہ ہے"۔
" تم کو پولیس کو ہی دینا چاہئے۔ تم اب اس محلے میں رہنے کے لائق نہیں ہو۔ بلکہ کسی
محلے میں رہنے کے قابل نہیں رہے۔ لیکن محلے والے نہیں چاہتے پولیس کیس ہو۔
میں تو یہی چاہتا ہوں تم سے ہماری جان چھوٹے"
ایک پڑوسی نے غصے میں جواب دیا۔۔۔
جنازے میں شامل ہونے کے لئے چند محلے والے جمع تھے سب ہی گاہے گاہے بول پڑے
"ہاں صحیح کہہ رہے ہو بھء۔ لیکن کریم چاچا محلے کا بڑا ہے وہ یہی چاہتا ہے
کہ محلے میں پولیس نہ آئے خوامخواہ محلے والے تھانے میں خواری بھگتے پھرینگے۔
اسے تو سزا بھی نہیں ہوگی۔ کہیں علاج کے لئے پڑا ہوگا۔ ہم رہ جائینگے پیچھے پولیس کو بھگتے رہیں گے"
"ہم روز کی دھاڑی پہ کام کرنے والے لوگ ہیں پولیس کیس ہو گیا تو مفت میں پیساء میں آئنگے
پولیس سے جان چھڑانا مشکل ہو جائیگی۔"
ایک اور پڑوسی نے ہاں میں ہاں ملاء۔
نعیم ڈھٹائی سے اس پڑوسی سے بولا جو پولیس بلانے کے حق میں تھا
"سن لو۔ جیل کرائے گا آیا بڑا۔ جب میں نے کچھ کیا نہیں۔ میت اندر رکھی ہے۔۔
بجائے اسکے کے میرے ساتھ کفن دفن کا انتظام کرو۔۔ میری دل جوء کرو۔۔
کچھ روپے ہاتھ پہ رکھو۔ چلے پولیس لانے۔۔۔۔ کوء دعا ہی کرو"۔
اپنی قمیص کا پچھلا دامن سر پہ کھینچنے کی کوشش کرتا ہے گلی ہوء قمیص سر تک کھینچنے پہ پھٹ جاتی ہے وہ چیتھڑے سے سر ڈھانپ کر دعا کرنے لگتا ہے
اس کی اس حال پہ چند لوگ کف افسوس بھرتے ہیں۔
" کیا حالت ہوگء رحم کھانے جیسا ہے بھی اور نہیں بھی"
ایک اور محلے دار بولا
" کپڑوں تک پہ خون لگا ہوا ہے لیکن کیسی کہانیاں بنا رہا ہے یہ دیکھو"
پھر کچھ نے آپس میں سرگوشی کی۔
"روپے اسکے پاس سے نہیں نکلے ورنہ یہ ابھی ہوتا نہیں یہاں۔ اسکے لئے کیا مرنا کیا جینا"
" صحیح بات ہے۔ ممکن ہے عابدہ بہن کے پاس پیسے ہوں ہی نہیں؟ اور غصے
میں اس نے مار ڈالا"
" نہیں نہیں۔ رات کریم چاچا کی دکان پہ گاڑی سے اتری تھی۔ ناشتہ کا سامان لینے۔
تب ہی اس نے چاچا کا ادھار بھی چکایا۔ اور چاچا کو بتایا کہ اسکو صدقے کے اتنے روپے مل گئے ہیں کہ آرام سے مہینے دو مہینے گزر جائیں گے۔ بڑے اونچے گھر کی شادی تھی چاچا کے پاس سامان ختم ہو گیا تھا انھوں نے کہا صبح پہنچا دیں گے یہ وہیں انکی نکڑ والی دکان پہ بنا پڑا ہوا تھا۔ چاچا نے اسے پیچھے جاتے دیکھا ہے
اور بیچاری کو صبح ہی نصیب نہیں ہوء"
"لیکن اسکا بندوبست کرنا پڑیگا"
"ہاں! مگر یہ تو پتہ چلے کہ ہوا کیا تھا؟ اب قاتل کو تو ایسے نہیں چھوڑ سکتے"۔
عابدہ کے گھر سے ایک خاتون کی آواز ابھری۔۔
" آپ میں سے کوء قرآن شریف یا چھپے پڑھے گا

تو اندر سے بھیج دوں"

مردانے میں سب کو چپ سی لگ گئی سب اپنی بغلیں جھانکنے لگے جیسے کسی نے جنازے میں فلم دیکھنے کی بات کر دی ہو۔

گہری خاموشی پہ وہ خاتون دروازے سے جھانکی کہ ممکن ہے انکی آواز نہ پہنچی ہو

"یہاں بے ادبی ہوگی بہن ہم مسجد میں پڑھ لینگے"

انکو جھانکتا دیکھ کر مردانے سے آواز ابھری۔

وقت ایسے گزر رہا تھا جیسے ایک ایک لمحہ سو سو سال کا ہو گیا ہو۔

"ابھی آدھا گھنٹہ باقی ہے ظہر کی نماز میں۔ کریم چاچا کفن دفن کا انتظام کرنے گئے ہیں دعا کرو سب کچھ خیر و خیریت اور خاموشی سے ہو جائے"۔

کہنے والا یہ بات کہہ کر ادھر ادھر ہو گیا۔

اندر سے پھر ایک عورت کی آواز آئی۔ "کب اٹھائیں گے؟"

"ظہر کی نماز کے بعد۔"

مردانے میں سے آواز آئی۔

"میرے میاں شبیر صاب کہہ رہے ہیں نیاز کا کھانا آج انکی یعنی ہماری طرف سے ہوگا۔

وہ کہہ رہے ہیں کل کے لئے آپ لوگ دیکھ لیں ابھی گھر پہ فون آیا بچے نے آ کر بتایا"

ہمدردی کے لئے آنے والوں کو سانپ سونگھ گیا ہو جیسے۔ کچھ نے اس حد تک گردن جھکا لی کہ گویا انکی موجودگی نہ ہونے جیسی معلوم ہو سب ایکدوسرے سے اشارے کرنے لگے۔

صورتحال بھانپ کر نعیم نے اپنا اصل مقصد بیان کیا۔۔

" کفن دفن کا انتظام ہو گیا اور مجھے خبر بھی نہیں کی۔ دیکھ لے عابدہ ہر جگہ مجھے بدنام کرتی پھرتی تھی تو کہ میں نشہ کرنے میں پیسے اڑا دیتا ہوں دیکھ لے۔۔

کسی نے میرے ہاتھ پر کھوٹا سکہ تک نہ دھرا۔۔

ارے اب میں بچوں کو کیا کھلاؤنگا

کوئی نوکری بھی نہیں دیتا مجھے۔ میں کیوں نہ تیری جگہ مر گیا"۔

ٹسوے بہانے لگتا ہے۔

اس پاس میں بیٹھے لوگ پہلو بدلتے ہیں جیسے بہت کچھ کہنا چاہتے ہوں پر اس بار سب سر جھکائے دانستہ خاموش رہے۔۔

"اماں۔۔اماں۔۔اٹھو نا اماں۔۔"

کامران نے نہ چاہتے ہوئے بھی عابدہ کی چادر پکڑ کے ہلانے کی کوشش کی۔

محلے کی ایک عورت نے اس کو پکڑ کر اپنے پاس بیٹھا لیا۔

"نہ میرے بچے۔۔مرنے والے کو تکلیف ہوتی ہے۔۔"

"یہ میری اماں ہیں۔ مجھ سے بولتی کیوں نہیں۔۔کوئی اسے ڈاکٹر کے پاس لے کر چلو۔۔

پہلوان کے بیٹے نے چھرا مار دیا ہے۔ صبح ابا نے بتایا ہے مجھے۔ چلو اماں اٹھو ڈاکٹر کے پاس چلو نا۔ اماں کیوں مرگ واسا خال۔۔بولتی کیوں نہیں۔ پہلوان چاچا کا بیٹا گندا ہے اماں تم ٹھیک ہو جاؤ۔۔۔ بولو نا سلمان بھائی۔ چلو نا لے کے اماں کو"

کامران نے اپنی دانست میں سب سے فریاد کر ڈالی۔

سلمان جو چھ سات سال کا تھا دو سال کامران سے بڑا تھا۔۔اپنی ماں کے سرہانے گھٹنوں میں منہ دئیے ہچکیاں لے رہا تھا۔ اس سے کامران کا سوال برداشت نہ ہوا تیزی سے اٹھ کر باہر کی طرف نکل گیا۔

پڑوسن نے دوسری پڑوسن سے کہا۔۔

" کوئی بیچارے بچوں کو تسلی دینے والا بھی نہیں۔ باپ نہ ہونے جیسا۔ مجھ سے تو انکی باتیں سنی نہیں جاتیں۔۔

کلیجہ کٹا جا رہا ہے"۔

دوپٹے سے آنسو اور ناک پونچھتے ہوئے انکی آواز رندھ گئی

"عابدہ کی طرف دیکھو تو ہول اٹھ رہا ہے۔ کل تک کیسی جیتی جاگتی بچوں کی فکر میں گھلی جا رہی تھی آج دیکھو خون میں لتھڑی پڑی ہے"۔

ایک اور پڑوسن بولی

"ہاں بہن بس موت یہی ہے۔۔۔زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ موت تو سب کو آنی ہے جلدی یا دیر سے۔ بس ناگہانی نہ آئے"۔

"ہائے۔۔"

انکی باتیں سنکر پاس بیٹھی ایک اور عورت ٹھنڈی سانس کھینچتی ہے۔۔

"نہلا دھلا دیا پر ایسا گہرا۔۔۔کٹا ہوا ہے۔ پتہ نہیں کیسے چاقو گھونپا ہے خبیث نے۔ کہ خون بند ہی نہیں ہو رہا۔ پورے تکیے بھر کی روئی لگا دی۔۔اتنا گہرا اور بڑا گھاؤ ہے۔

اگر بروقت اسپتال بھی چلی جاتی تو نہ بچتی"۔۔

دونوں کی باتوں پر باقی محلے والیوں کے بھی کان لگ گئے

"ہائے۔۔"

وہی پڑوسن زور سے چیخ کر رو پڑتی ہے

قریب بیٹھی ایک دوسری عورت صبر دلاتی ہے۔۔

ذرا سی خاموشی ہوتی ہے پھر آپس میں باتیں کرنے لگتی ہیں

"بس جو خدا کو منظور ہو۔۔ بیچاری کی موت

ایسے ہی لکھی تھی"۔
میت کی سمت دیکھتی ہے
"نیل ہی نیل پڑے تھے جسم پہ۔"
"دیکھو تو خون اب بھی نکل رہا ہے۔ جنازہ تک آ گیا ہے"۔
"ہاں بہن سنا ہے یہ نیک لوگو کی پہچان ہے۔ میت پہ خون ہو تو مرنے والے کو شہادت کا درجہ ملتا ہے"
"مجھے تو یہ سوچ سوچ کے ہول ہو رہا ہے کہ اگر پولیس آ گئ، تو بیٹھے بٹھائے سب کی شامت آئے گی۔ ہماری تو خیر ہے مگر محلے کے مردوں کی خیر نہیں"۔
"جب ہی تو کریم چاچا خاموشی سے کفن دفن کرنے کا کہہ رہے تھے۔
اب کوہ رشتے دار بھی نہیں"۔
"سنا تھا بہت تھے لیکن نشے کی لت کی وجہ سے سب نے ملنا جلنا چھوڑ دیا تھا
اس میں بیچاری عابدہ کا کیا قصور تھا اگر اسکا میاں نشہ کرنے لگا تھا"۔
"ہاں بھء مرد کے کیے کی سزا بھی بیچاری عورت بھگتے۔ بہت ناانصافی ہے،
بہت ظلم ہے"۔
"عابدہ کو بھی نعیم کو چھوڑ دینا چاہیے تھا"۔
"صیح کہہ رہی ہو"۔
"محلے والو سے عابدہ نے خلع کی بات کی تھی۔ سب نے یہی کہا مرد سے عزت ہے
گھر بار لے کے بیٹھی ہو۔ کہاں در بدر ہو گی"۔
"یہ مرد ایسی ہی بکواس کرتے ہیں۔ خاص طور سے جب عورت کسی مشکل میں ہو عورت کی پریشانی انکو پریشانی نہیں لگتی۔ عورت کیوں در بدر ہو نکال باہر کرتی۔
نعیم جیسے بے حس شوہر کو۔ نہ سرپرستی نہ کوئی حق ادا کرنے جیسا۔ خوامخواہ میں سرپرست۔۔ سربراہ۔ ہونہہ۔ یہی نشہ نعیم کی جگہ اگر عابدہ بہن کرتی تو یہ مرد نعیم کمبخت کو یہی صلاح دیتے؟ وہ کب کا دوسری شادی کر چکا ہوتا۔ یا الگ ہو گیا ہوتا"۔
"بات یہی ہے۔ مرد اپنے اوپر آئے پریشانی کو طول نہیں دیتے۔ پھر عورت کیوں بھگتی رہے۔ صلاح تو میں نے بھی بیچاری کو یہی دی تھی۔ سچ پوچھو تو سنتے چلے آئے ہیں
عورت کی عزت مرد سے ہے عورت کا کیا مقام ہے مرد کے بغیر"
"جس پہ گزرتی ہے وہی جانتا ہے۔ جیسے حالات ہوں صلاح بھی ویسی دینی چاہئے، عورت کو کہیں تو خودمختاری کا حق ملنا چاہئے، شادی کے بعد ہی سہی۔
یہ کیا بھگت وہ رہی ہے اور صلاح ان سے لے جو اپنے گھروں میں خوش باش بیٹھے ہیں، کس نے سمجھا بیچاری کو۔ کون جھیل رہا تھا مصیبت"
"ارے چھوڑو۔ اب جو ہونا تھا وہ ہو گیا آپس میں اب کیا بحث کرنا۔ اب بیچاری اچھی جگہ ہے
اسکی مغفرت کی دعا کرو"
غصے میں بھڑکتا دیکھ کر ایک اور پڑوسن بول پڑیں
"لیکن یہ ہیروئنچی تو ہمارے سر پہ عذاب بنا ہوا ہے نا۔ مجھے تو ڈر لگتا ہے
ہمارے بچے اسکے بیٹھے کی وجہ بیٹھے کا شکار نہ ہو جائیں۔ اسکی وجہ سے نشہ بیچنے والے اسی محلے کے آریب قریب منڈلاتے ہیں"۔
"بس اللہ تعالی سب کو محفوظ رکھے"۔
"مرنا تو اسے چاہیے تھا"۔
ایک عورت نے پھر آہ بھری۔۔
"عابدہ کے چلانے کی آواز تو مجھے آ تھی رات کا ایک یا ڈیڑھ بج رہا ہو گا۔ بس میں سمجھی کہ روز کا لڑائی جھگڑا مار پیٹ ہے۔ لگ تو یہی رہا تھا کہ نعیم نشئی سے لڑائی ہو رہی ہے۔
صبح سلمان نے آ کر دروازہ پیٹا۔ انکو بتایا کہ اماں کو پہلوان کے بیٹے نے چھرا مار دیا ہے۔ میں اور یہ ساتھ ہی نکلے کلیجہ منہ کو آ گیا۔ سامنے دروازے کے باہر عابدہ کی لاش خون میں لت پت پڑی تھی"۔
"اللہ توبہ۔۔ بس خدا سب کو محفوظ رکھے۔ پہلوان، کا بیٹا لاکھ غنڈہ سہی لیکن کبھی محلے میں کسی سے لڑائی جھگڑا نہیں کیا۔ بچے کو نعیم نشء نے ہی بولا ہو گا۔
یہ دونوں سو رہے تھے۔
"چھرا ماریگا تو میں پہلی بار سن رہی ہوں۔ ہاں البتہ محلے والوں سے آتے جاتے سو پچاس ضرور ہوتا تھا۔ کبھی نہیں سنا کہ انور نے کسی کو چاقو دیکھایا ہو"۔
"صیح کہہ رہی ہو۔ پہلوان کے بیٹے انور کے بارے میں، میں نے بھی یہی سنا ہے۔
عورتوں سے کبھی نظر بھی نہیں ملاء اس نے۔
روپے چھیننا اور قتل کرنا۔۔
نہ بابا یقین نہیں ہوتا۔ پیسے کی خاطر کو اس حد تک گر جائیگا"۔
"پیسہ بری چیز ہے۔ بڑا اچھا کام لگا تھا اس بار عابدہ کا۔ دبء سے لوگ آئے ہیں
اپنی بیٹی کی شادی کرنے۔ چار دن ہوئے تھے کل کیسی خوش تھی۔ مجھ سے روز کہہ کر جاتی تھی بچوں کا خیال رکھوں"
"تدفین کے بعد سب محلے والوں کو مل کر وہ فیصلہ کرنا ہو گا"
"سچ پوچھو تو مجھے تو کمبخت اس خبیث نعیم کی کارستانی لگتی ہے یہ الزام پہلوان کے بیٹے انور پہ لگا رہا ہے"۔
"خدا جانے کیا ہوا کیا نہیں کوہ تو چکر ہے۔ اس نشئی کا دماغ اتنا نہیں چلتا"۔
"ارے نے دو بہن جب نشہ ٹوٹتا تھا کیا واہی تباہی بکتا تھا۔ توبہ۔ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ یہ وہی نعیم بھاء

ہیں جو ٹیکسی چلایا کرتے تھے۔ میرے میاں کے بچپن کے دوست تھے۔ بی اے پاس ہو کر ٹیکسی چلانے پر اکثر میرے میاں چھیڑا کرتے تھے۔۔ کہ تم سے ہم اچھے آٹھ جماعتیں پڑھ کے ٹیکسی چلاتے ہیں تم بی اے پاس ہو کر یہی کام کرتے ہو۔۔

نعیم اور عابدہ کی زندگی ہم سے بہت اچھی تھی اور دیکھو تو آٹھ سال میں کیا سے کیا ہو گیا۔۔"

"خدا غارت کرے ان نشہ ہیروئین بیچنے والے کو۔۔ نا معلوم انکا کوہ ہوتا بھی ہے یا نہیں۔۔

انکا اپنا کوہ نشہ کرنے سے مرتا ہے یا نہیں۔ کیسی لت لگی برباد ہو گیا نشہ چھوڑ نہیں سکا"۔

"کیسی قیامت ٹوٹ گی ہ اس گھر پہ۔ ہنستا بستا گھر اجڑ گیا"

"یہ نشہ بیچنے والے ضمیر فروش ہوتے ہیں انکا کوہ دین ایمان نہیں ہوتا سوائے

روپے پیسے کے"۔

"خدا ان پر اپنا قہر نازل کرے۔۔ تباہ و برباد ہوں انکا گھر بھی ایسے برباد۔۔۔۔"

نازنین ہمدانی ملک سے اس سے زیادہ نہ پڑھا نہ جا سکا۔۔ اس نے کہانی ادھوری چھوڑ دی۔۔ کہانی ابھی باقی تھی اسے اس بات سے غرض بھی کیا تھی کہ قتل کیسے ہوا۔۔

اسے تو نشے کرنے والوں کے گھروں کی اندھوناک زندگی کا پہلی بار پتہ چلا تھا۔

کہانی اصل میں نشے کا شکار ہونے والو کے متاثرہ گھروں کی ہولناک آپ بیتیاں تھیں۔

اسی میں پہلی کہانی سلمان نعیم نام کے کسی پیشہ ور گداگر کی تھی جو اس نے کسی این جی او کے ورکر کو سنا ہ تھی۔ کچھ عرصے پہلے حکومت نے بڑھتے ہوئے پیشہ ور گداگروں کے خلاف مہم کا آغاز کیا تھا اسی میں سلمان نعیم پکڑا گیا تھا۔ یہ تیس اکتیس سال کا نوجوان گداگروں کا سرغنہ تھا۔ یہ شہر کی جیتی جاگتی کہانیاں تھیں۔ لوگوں کی زندگی تھی۔ ایسے لوگ جو اپنے بچپن سے ماضی کی تلخیوں کے ساتھ بھی اپنا مستقبل روشن نہ کر سکے۔

نازنین کی اس رسالے پر توجہ نشہ کا لفظ پڑھتے ہی ہو گئی تھی۔ اس نے بیڈ پہ لیٹے لیٹے سگریٹ کا کش لگایا۔ اسکا ڈپریشن اسوقت اتنا زیادہ بڑھ چکا تھا اسکے کندھے اتنے بوجھل تھے کہ جیسے اسپر کسی نے سمینٹ سے پلستر کر دیا ہو۔ اس نے پوری کہانی ختم کی۔

اس سے پہلے وہ بھی اوروں کی طرح نشہ کرنے والوں کو کم ہمت، کم حوصلہ اور جاہل سمجھتی آ ئی تھی۔ جو حالات کا جواں مردی سے مقابلہ کرنے کے بجائے نشہ کرنے لگتے ہیں۔ جو نشہ نہیں کرتے اگر انکے گھر میں انکا سرپرست نشہ کرنے لگے تو مصائب کی نہ ختم ہونے والی قیامت انکی زندگی پر روز ٹوٹتی ہے۔ اس گھر انکا مستقبل اتھاہ گہرائیوں میں گم ہو جاتا ہے۔

اس پر یہ حقیقت "سلمان نعیم" کی ہولناک آپ بیتی پڑھنے کے بعد پہلی بار آشکار ہوء۔

"بددعائیں"۔۔۔ نشہ بیچنے والو پہ بددعائیں پڑھ کر اسکا دل دہل گیا۔

وہ اپنے قیمتی ریشمین کمفرٹر میں منہ دے کر رو پڑی۔۔ اسکے رنگے ہوئے سنہری بال شانوں سے بکھر کر منہ پہ آ گئے۔

چند دن پہلے کی بات ہے۔

نازنین ہمدانی ملک کے اعزاز میں ایک تقریب رکھی گ ہ تھی جس میں معززین اور پریس کو مدعو کیا تھا۔ یہ پارٹی شہر کی سب سے بڑی این جی نے شہر کا سب سے بڑا ڈونیشن ملنے پر منعقد کی تھی۔ پارٹی خوب رہی۔ پارٹی کے اختتام پر چلتے چلتے کسی ادارے کے نمائندے نے نازنین کے ہاتھ میں ایک رسالہ پکڑا دیا تھا۔

"پڑھیے گا ضرور"

دینے والے نے اپنی دانست میں پڑھنے پہ زور دیکر گویا پوری کوشش کر ڈالی تھی کہ نازنین یہ رسالہ کسی طرح پڑھ لے۔

اس نے دینے والے کی اس بات پر نہ چاہتے ہوئے بھی رسالہ اپنے قیمتی ہینڈ بیگ میں ڈال لیا تھا۔ گھر آکر اسکا ڈپریشن تقریبا ختم ہو چکا تھا۔ شاید نیکی کے کام میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ یہ بڑے سے بڑے دکھ پر مرہم کا کام کرتی ہے۔ نازنین کو تو محض ڈپریشن تھا۔ لیکن وہ اب بہت مطمئین تھی۔

اس کو خوش دیکھ کر اسکے شوہر شہریار کی جان میں جان آ ئی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اب نازنین جلد سے جلد بچوں کے پاس کینیڈا چلی جائے۔ شہریار کا کینیڈا جانے کا اصرار کرنا گویا نازنین پہ پھر بھاری پڑ گیا تھا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اخبار کا وہ تراشہ دیکھنے لگی جو اس نے پھاڑ کر اپنی جیولری کی دراز میں چھپا دیا تھا۔ یہ خبر دیکھتے ہوئے اسے اپنی آنکھوں پہ بے یقینی سی ہوتی تھی خبر شہر کے کامیاب تاجروں کے بارے میں تھی۔ جس میں شہریار کا نام بھی تھا۔

خبر کے آخری حصہ پہ نازنین کی نظریں جم کے رہ گئی تھیں۔

"شہر کے امیر ترین کامیاب بزنس مین میں شہریار ملک کا نام سرفہرست ہے

واضح رہے کہ تیس سال پہلے انھوں نے کاروبار کی ابتدا ڈرگ ڈیلنگ سے کی۔

شہریار ملک، ملک کے مشہور صنعتکار خورشید ہمدانی کے داماد بھی ہیں" ظاہر ہے یہ خبر شہریار نے بھی پڑھی تھی۔ نازنین کے پوچھنے پر پہلے شہریار مکرتا رہا کہ یہ خبر اسکے بارے میں نہیں ہے۔ لیکن نازنین کی وضاحت پہ شہریار نے اسے اپنے خلاف گھناؤنی سازش، اپنی بزنس کی بڑھتی ساکھ پر دوسرے بزنس مین کی گھٹیا چال قرار دیا۔

شہریار کا رویہ نازنین کے ساتھ جب ہی سے تلخ تھا اور وہ نازنین پہ تقریبا روز دباؤ ڈالتا تھا کہ وہ بچوں کے پاس کینیڈا چلی جائے۔ نازنین کا ڈپریشن انہی دنوں شروع ہوا تھا۔

شہریار ملک جاگنگ سے واپس آئے ایک نظر

نازنین پہ ڈالی جو تکیے میں منہ دیئے آنسو بہا رہی تھی۔

"سوئمنگ کے لئے چلو۔ کیا حالت بنالی ہے کیا بچوں جیسی حرکتیں کرنے لگی ہو"۔

نازنین نے سر اٹھا کر سرد لہجے میں کہا

"کاش میں نے تم سے شادی نہ کی ہوتی۔ کاش۔ میں اکیلی ہوتی۔۔ کسی شہریار ملک کا نام۔۔۔ نازنین ہمدانی سے نہ جڑا ہوتا۔۔ مجھے کس چیز کی کمی تھی۔ کیوں میں نے تم سے شادی کی"

"ہیل آف اٹ۔۔"

شہریار منہ منہ میں انگریزی میں ک، گالیاں دے گئے۔ چند لمحے بعد اس نے جذبات پہ کنٹرول کرتے ہوئے کہا۔۔

"اینٹی ڈپریشن کی ٹیبلٹس لی تم نے۔ پھر وہی دورہ پڑ رہا ہے۔۔۔"

"تم نے کتنے گھروں کو اجاڑا ہے کچھ اندازہ ہے تم کو۔۔۔

عابدہ، سلمان، کامران، نعیم ان جیسے ک، ان کے بنتے بستے گھر سب تمہارے دھندے کی نظر ہو گئے۔۔ ان سب کو تباہ کرنے والے تم ہو شہریار۔۔۔ ڈرگ ڈیلر"

"کیا بکواس کر رہی ہو۔ کیا بکواس پڑھ رہی ہو۔ ادھر دکھاؤ"۔۔۔

اس کے ہاتھ سے میگزین چھین کے دیکھتے ہیں

"سچی کہانیاں۔۔ نشے سے تباہ حال سلمان کے گھر کا سچا واقعہ۔۔۔"

ربش۔۔ بکواس یہ دو دو ٹکے کے ادب کے نام پہ بکنے والے میگزین انکی کوئی وقعت نہیں ہے۔ ایسے ربش اردو رسالے پڑھو گی تو ایسی مڈل کلاس عورتوں والی باتیں کرو گی۔۔"

اس نے نہایت نفرت سے میگزین کو پھاڑ کے پھینک دیا۔ نازنین چیختی رہ گئی

شہریار نے غصہ کو کنٹرول کر کے محبت سے نازنین سے کہا۔۔

"شادی کے بیس بائیس سال بعد اس قسم کی باتیں کرنیکا مطلب۔ این جی اوز کو ڈونیشن دو اور خوش رہو۔ یہ اسی این جی او سے ملا تھا تمھیں۔ اس این جی او کو تو میں دیکھ لونگا۔ ٹکے ٹکے کے یہ رسالے سب فضول ہوتے ہیں۔۔ کوء انگریزی میگزین پڑھ لو"۔

"میں نے اپنی مرضی سے خریدا ہے۔۔"

نازنین نے صفاء سے جھوٹ بولا

"تمھاری ان باتوں سے نقصان صرف ہماری اولاد کو ہوگا۔

جان میں نے کاروبار جیسے بھی شروع کیا تھا وہ شادی سے پہلے تھا۔ انجانے میں غلطی ہو جاتی ہے میں نہیں جانتا تھا وہ لوگ کون ہیں جو کاروبار کے لئے پیسہ دے رہے ہیں۔ میں سچ کہہ رہا ہوں میں جب اس شہر میں نیا نیا آیا تھا۔ اف میں سب تم کو کیوں بتا رہا ہوں۔۔

دیکھو نازنین میں اس گھر کا سرپرست ہوں۔ اور اب شہر کا معزز اور کامیاب بزنس مین ہوں۔

سالوں پہلے کی بات ہے یہ۔۔ ان ٹکے ٹکے کی کہانیوں میں کوء صداقت نہیں ہے یہ جذباتی باتیں، کہانیاں لکھتے ہی اسی لئے ہیں کہ انکا مال بک جائے۔ تم جیسی مشہور اور امیر عورتیں انکا ٹارگٹ ہوتی ہیں ناز۔۔ میری جان۔۔ تم گرامر اسکول سے پڑھکر یہ کریپ پڑھنے کا سوچ بھی کیسے سکتی ہو۔۔ ویلس از فار دی مڈل کلاس ڈارلنگ۔۔

یہ سب منصوبے کے تحت ہو رہا ہے۔ پبلشر دی۔ اور پھر یہ کریپ تمھارے ہاتھوں میں پکڑا دیا۔ تا کہ تمھارے جذبات سے کھیلیں۔ مجھے کمزور کرنے کی سازش ہے۔"

"شہریار مجھے تمھارے ساتھ نہیں رہنا۔ چند دن پہلے تمھارا نام انٹرنیشنل میگزین میں بھی ان لوگوں کی لسٹ میں تھا جنھوں نے اپنے بڑے بڑے کاروبار کالے دھندوں سے شروع کئے"۔

"تمھیں اپنے بچوں کے مستقبل کی کوء پرواہ نہیں وہ تباہ ہو جائینگے۔ وہ اپنی عمر کے بہترین حصے میں ہیں۔ ناز اپنے بچوں کے لئے ہوش کے ناخن لو۔ بچے تمھاری گرتی ہوئی صحت سے پریشان ہیں کینڈا سے روز فون کر رہے ہیں کہ مما کو کیا ہوا ہے۔"

شہریار نے اپنے گناہوں کا کچا پکا اقرار کر کے اسے سمجھانے کی کوشش کی جو بیسود رہی

"تمھیں پتہ ہے نعیم تو نشہ سے تباہ ہوا۔ اس کی بیوی اسکے ہاتھوں ناگہانی موت کا شکار ہوگئی۔

کامران کہیں لاپتہ ہو گیا۔ اور سلمان گداگری کرنے لگا۔ وہ پیشہ ور گداگر ہے۔ اسکے پاس سب کچھ ہے۔ جو اس نے بھیک سے جمع کیا۔ بھیک جس سے اسکی ماں کو نفرت تھی۔

پولیس آئے دن اسے پکڑتی رہتی ہے۔۔ وہ اپنے گھر کی تباہی کا ذمہ دار منشیات فروشوں کو سمجھتا ہے۔ اسکا گھر اسکا مستقبل سب تباہ ہو گیا۔ ایک ڈرگ ڈیلر تو تم بھی رہے ہو۔

پھر تم معزز کیسے ہو گئے؟

تم نے کتنے بچوں کا مستقبل تباہ کیا ہے، تمھارے بچوں کا مستقبل بھی تباہ ہو کے رہے گا

شہریار ملک"

"نازنین۔۔۔"

شہریار اسے غصے سے بیڈ پر دھکیل دیتا ہے۔۔

"یو آر آؤٹ آف یور مائینڈ۔۔ مجھے ہی کچھ کرنا ہوگا میں تمھاری اس بکواس پہ اپنے بچوں کا مستقبل داؤ پہ نہیں لگا سکتا"۔

شہریار غصے سے کمرے سے نکل جاتے ہیں۔۔

چند دن بعد اخبارات میں آدھے صفحہ پر نازنین ہمدانی ملک کی سوئم کی اطلاع تھی۔

شہریار ملک نے انتہاء دکھ کے ساتھ فاتحہ کی درخواست کی تھی۔ کئی اخبارات نے خبر بھی چھاپی تھی جس میں لکھا تھا، نازنین ہمدانی ملک کی ناگہانی موت خواب آور ادویات کی زیادہ مقدار لینے سے ہوء۔

شاعری

کٹ گئی ہے پتنگ زور سے پھر
ہاتھ زخمی ہوئے ہیں ڈور سے پھر
چاندنی لڑ پڑی چکور سے پھر
جاگ جائے نہ چاند شور سے پھر
چوکیداروں سے کیا گلہ شکوہ
بات کرنی پڑے گی چور سے پھر
تازہ دم کر دیا محبت نے
ہو گئے ہیں نئے نکور سے پھر
گھنٹیاں بج رہی ہیں کانوں میں
آنکھ لگنے لگی ہے شور سے پھر
دل کا دلدار سے معاملہ بھی
سودے بازی ہے مفت خور سے پھر
شکریہ گرم گرم سانسوں کا
زخم بھرنے لگے ٹکور سے پھر
دیکھیے کون کس کو پڑتا ہے
چور ملنے گئے ہیں مور سے پھر

مسعود احمد/اوکاڑہ

آج دل کو ہیں وہ باتیں جانے کیوں دوہرانیاں مسعودؔ
یاد کر کے جن کو ہیں آنکھیں بھر آنیاں مسعودؔ
اب نہ ہجر کی نہ وصال کی ہیں کہانیاں مسعودؔ
اگر ہیں باقی تو وحشت کی لن ترانیاں مسعودؔ
کبھی نہ وہم میں تھیں بے سرو سامانیاں مسعودؔ
مگر دیوار و در کی تھی قسمت ویرانیاں مسعودؔ

اگر وہ اذنِ نظر بخش دے غنیمت ہے
محال باتیں اُسے من کی سنانیاں مسعودؔ
وہ ایک کچا گھڑا اور چناب بپھرا ہوا
مگر تھیں عشق کی رُت پر جوانیاں مسعودؔ
چمن، بہار میں اہلِ ہوس نے جو لُوٹا
ہم اُسی کی کرتے رہے باغبانیاں مسعودؔ
کہاں گئے میرے وہ دوست، ہم نفس وہ ندیم
تھیں جن سے صحبتیں اپنی پرانیاں مسعودؔ
نہ وہ اب بہار کا رنگ ہے نہ وہ انتظار کا حوصلہ
کہ راہ تک تک مدتوں اکھیاں تھک جانیاں مسعودؔ
خیال پر بھی ہو قابو، بیاں پر ہو دسترس
ہوں رنگِ شوق میں معجز بیانیاں مسعودؔ

خالد مسعود/لاہور

ہمیں شکایت نہیں کہ کیوں ہیں اُداس رہرو اُداس راہیں
جو زندگی ہی میں تلخیاں ہوں کہاں سے لائیں مٹھاس راہیں
ہماری قسمت کہ منزلوں کا کہیں تعین نہیں ہوا ہے
کہ خضر کی پیروی میں آئیں گی اب نہ دل کو یہ راس راہیں
کوئی بتائے کہ منزلوں کی ہوئی نہ پہچان کس سبب سے
بڑے قیافہ شناس رہرو، بڑی قیافہ شناس راہیں
عجب اُمیدوں کا رنگ و نغمہ نصیب تھا اُنکی صحبتوں میں
بچھڑ کے رہ جائیں سارے ساتھی تو کیوں نہ ہوں محوِ یاس راہیں
ہماری آنکھیں ترس گئی ہیں تیرے نظارے کی اک جھلک کو
کبھی تو آہٹ سُنیں گے تیری بُجھا ہی دیں گی یہ پیاس راہیں
ترے مسلسل سکوت پر بھی ہم اتنے نومید تو نہیں ہیں
عجب امیدیں لیے دلوں میں لگائے بیٹھی ہیں آس راہیں
نہ رنگ و خوشبو نہ صوت و نغمہ نہ دلنوازی ہے رہگذر میں
چلے گئے تم تو رہ گئی ہیں محبتوں کی اداس راہیں
ہماری محرومیوں کے قصے ہوئے ہیں رسوا جہاں میں کیونکر
ہمیں ہے کیوں انتظار اُن کا، نہ کر سکیں گی قیاس راہیں

خالد مسعود/لاہور

حاصل پور میں مقیم ممتاز نعت گو شاعر

محمد امین ساجد سعیدی

(صدارتی قومی سیرت ایوارڈ یافتہ)

کا نعتیہ مجموعہ

اے سیّدِ لولاک ﷺ

نہایت خوب صورت انداز میں شائع ہو گیا

ناشر

نستعلیق مطبوعات

فیروز سنٹر غزنی سٹریٹ لاہور

مزے کی بات یہ ہے کہ اس کی رفتاری بھی میرے جتنی ہی تھی جب اسکی خودکار کیمرے نے تصویر کشی کی۔ عدالت میں جج کے روبرو مجھ سے پہلے وہ پیش ہوا تھا، اور اس پر چالیس ہزار روپے جرمانہ عائد کیا گیا تھا۔ جب میں کمرہ عدالت سے باہر نکلا تو اتفاق سے کار پارکنگ میں مجھے وہی برازیلی لڑکا مل گیا۔ میں نے اس سے استفسار کیا کہ یار! ہمارا جرم تو ایک جیسا تھا مگر ظالم جج نے مجھ پر جرمانہ تمہارے مقابلے میں زیادہ کیوں عائد کر دیا ہے؟ اس نے الٹا سوال داغ دیا کہ تم نے جج کے سوال کا جواب کیا دیا تھا؟ میں نے کہا کہ یہی بتایا تھا ایک نجی مصروفیت کے سلسلے میں ایک جگہ جا رہا تھا۔ یہ سن کر برازیلی نے مجھے کہا کہ تم نے غلطی کر لی۔ اگر تم میری طرح یہ جواب دیتے کہ میں کام کے سلسلے میں کہیں جا رہا تھا تو تمہارا جرمانہ بھی میری طرح کم ہی ہوتا۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ اس طرح تو تمام ملک کے لوگ ہی یہ بیان دیں گے کہ وہ محنت، مزدوری اور کام پر نکلے ہوئے تھے، تو جناب عرض یہ ہے کہ جاپانی جھوٹ نہیں بولتے، میرا مطلب ہے کہ بالکل بھی اس فن سے ناآشنا ہیں۔

یہاں مجھے اپنے دفتر کے ہمسائے میں واقع الیکٹرک بیٹری بنانے والی کمپنی کا مالک بھی بار بار یاد آ رہا ہے، جسے میں سالہا سال تک اس کمپنی کا مزدور سمجھتا رہا۔ گو کہ جب وہ پہلی مرتبہ تعارفی ملاقات کے لیے آیا تو اس نے بتایا تھا کہ میں سامنے واقع فیکٹری میں کام کرتا ہوں، ہم ہمسائے ہیں۔ پھر گاڑیوں کی بیٹری لینے یا چھوڑنے کے لیے آتا تو خود ہی بیٹریاں اٹھا اٹھا کر اپنی گاڑی میں رکھتا اور نکالتا تھا۔ ہمارے ہاں مالک بھلا ایسے تھوڑی ہوتے ہیں۔ اس کے مالک ہونے کا انکشاف تو یوں ہوا کہ ایک دن میں اس کی فیکٹری میں چلا گیا۔ گو کہ وہ مزدوروں کے لباس میں ملبوس تھا مگر سب ملازمین اسے ''ساچو'' یعنی باس کہہ کر پکار رہے تھے۔ پاکستانی حساب سے اسے ارب پتی کہوں تو کسر بیانی ہو گی۔ میرے مشاہدے کے مطابق پاکستانی لوگ جاپانیوں سے زیادہ ذہین ہیں۔ ہمارے قدرتی وسائل بھی جاپان کے مقابلے میں بہت زیادہ ہیں۔ عالمی سطح پر کیے گئے کئی سروے بتاتے ہیں کہ دنیا کی ذہین ترین اقوام کے پہلے پانچ درجوں میں پاکستانی شامل ہیں۔

ہمارے قدرتی وسائل اور ہماری قوم کی ذہانت اپنی جگہ مسلم حقائق ہیں۔ مگر یہ چیزیں ترقی کی ضمانت نہیں ہو سکتی ہیں، کسی دانا کا قول ہے کہ ''ذہانت کچھ کچھ ہے اور محنت سب کچھ'' جو خالق کائنات ہمیں یہ حکم دیتا ہے کہ مزدور کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کر دی جائے، وہ رب العالمین ایسی ناانصافی نہیں کر سکتا کہ خود محنت کرنے والی اقوام اور افراد کو ثمر بار نہ کرے، ان کی مزدوری کا صلہ عطا نہ فرمائے۔ ایسا تو اس کی رحمت اور بے نیازی سے ممکن ہے کہ کچھ اقوام کو بغیر محنت کے قدرتی وسائل سے مالا مال کر دے، ایسے وسائل جن کے بل بوتے پر زندگی کی آسائش پوری قوم کا مقدر بن جاتی ہیں، یہ مگر تاریخ میں کبھی بھی نہیں ہوا کہ محنتی اقوام کو عروج حاصل نہ ہوا ہو۔ دنیا میں ترقی کا اصول مستقل محنت ہے اور یہ ایک کھلا راز ہے۔

محبت

محبت ایسا سچ ہے
جو ہمیشہ سے ہے دنیا میں
مگر پھر بھی پرانا ہو نہیں سکتا
کہ ہر اک چاہنے والے کی چاہت اک نیا سچ ہے
محبت ایسا رستہ ہے
جو قائم ہے ازل سے
پر اس کے سب مسافر
ہر قدم پر
ابھی تک تازگی محسوس کرتے ہیں
محبت ایسا سورج ہے
کہ جس کی ہر کرن دھرتی پہ پہلی بار اُترتی ہے
محبت جادوئی سا جذبہ
کہ جب من میں اُترتا ہے
تو دھڑکن وہ نہیں رہتی
یہ دل ایسے بدلتا ہے
عجب ہی معجزہ دیکھا
زمانے میں محبت کا

انتظار

برکھا رت بھی
بیت گئی ہے
جانے ساجن کب آئے گا؟
میرے بھیجے ہوئے سپنوں کو
مجھ تک واپس کب لائے گا......؟

عامر بن علی

آغا نثار/لاہور

ابھی سب ہنس رہے تھے رو دیے ہیں — خبر کیسی نکل آئی خبر سے

مجھے جانا پڑا جب اپنے گھر سے
لپٹ کے رو دیا دیوار و در سے
قلم، قرطاس، خوشبو اور حیرت
ملا کیا مجھ کو عمر مختصر سے
بہاریں اور ڈاریں لوٹ آئیں
نہ جانے کب وہ لوٹ آئیں سفر سے
میں کاغذ پر لکیریں کھینچتا ہوں
مری پہچان ہے میرے ہنر سے
ابھی سب ہنس رہے تھے رو دیے ہیں
خبر کیسی نکل آئی خبر سے
تیری یادیں ہی باقی رہ گئی ہیں
یہ قرضہ بھی اُتر جائے گا سر سے
جنونِ سنگ باری اوج پر ہے
کہ شاخیں جھک گئیں بارِ ثمر سے
تری یادوں کی یخ بستہ ہوا میں
ٹپک کر جم گئی چھاؤں شجر سے

خاک سے دن اُٹھانے لگتا ہے
تھک کے مزدور جانے لگتا ہے
کتنا ظالم ہے جو پرندوں کے
باندھ کر پر اُڑانے لگتا ہے
ریت تو پیاس ہے سمندر کی
شور دریا مچانے لگتا ہے
رات سوچوں میں بیت جاتی ہے
دن کو سورج جگانے لگتا ہے

سوچ کر تجھ کو چاند کو دیکھا
چاند شکلیں بنانے لگتا ہے
عشق کا کھیل بھی انوکھا ہے
جھوٹ بھی سچ دکھانے لگتا ہے
جیب خالی ہو تو پہاڑ سا دن
مشکلوں سے ٹھکانے لگتا ہے
میری آنکھوں کی خشک جھیلوں میں
کوئی کشتی چلانے لگتا ہے
خالد احمد کی یاد یوں آئی
جیسے درویش آنے لگتا ہے
کاپیوں پر کوئی نثار آغا
اُجڑے منظر بنانے لگتا ہے

ہر پل جو تکرار بہت ہے
اس کا مطلب پیار بہت ہے
آپ نے دیکھا میری جانب
اتنا ہی سرکار بہت ہے
عزت شہرت دین خدا کی
ہر کوئی دعویدار بہت ہے
بچوں کی آنکھوں میں حسرت
پھیلا ہوا بازار بہت ہے
صدیوں جیسا اک اک لمحہ
بن تیرے دشوار بہت ہے
دل میں کچھ اور منہ پہ کچھ ہے
دنیا دنیا دار بہت ہے

دریا کے اس پار کا منظر
دریا کے اس پار بہت ہیں
خاموشی ہو گہری جتنی
چڑیا کی چہکار بہت ہیں
سب کی جھولی بھر دے مالک
مجھ کو بھی درکار بہت ہیں

پرندے ہیں شام و سحر کی طرح
بلائے کوئی تو شجر کی طرح
محلے کے افراد کے درمیاں
کوئی رنگ میرے نگر کی طرح
اسے سوچنا گرم دوپہر میں
وہ اُترے گا ٹھنڈی سحر کی طرح
تری جستجو تھی کسی خواب سی
ترا ساتھ زیر و زبر کی طرح
مکمل ہوا ہی نہیں جو کبھی
ادھورا ہوں ایسے ہنر کی طرح
دعا کی طرح یاد رکھنا اسے
سفر میں رہو ہم سفر کی طرح
سیاست نے ہانکا لگایا بہت
سلامت ہوں پھر بھی بشر کی طرح
ادھورا پڑا ہے وہ اب چاک پر
کبھی خود تھا جو کوزہ گر کی طرح
خوشی رنگ خوشبو سے بن کر ملے
خبر کوئی اچھی خبر کی طرح

گل فراز/بڈالی

میں اپنے آپ کو مصروف ہی رکھوں تو بہتر ہے
یہاں آرام تو مجھ کو فراغت سے نہیں ہوگا

اشارے سے جو ہوگا وہ وضاحت سے نہیں ہوگا
کہ باتوں میں اثر ایسی طوالت سے نہیں ہوگا
کسی سے پھر دعا بھی تو کرانی چاہیے ہم کو
یہ مشکل کام ہے، اور صرف محنت سے نہیں ہوگا
ذرائع دوسرے بھی ڈھونڈنے ہوں گے ہمیں اب تو
کہ اب یہ مسئلہ حل، خالی منت سے نہیں ہوگا
اضافہ کچھ نہ کچھ قیمت میں کرنا ہی پڑے گا اب
وگرنہ فائدہ اتنی رعایت سے نہیں ہوگا
کچھ اور چیزوں کو بھی مد نظر رکھنا ضروری ہے
کبھی معیار کا اندازہ قیمت سے نہیں ہوگا
میں اپنے آپ کو مصروف ہی رکھوں تو بہتر ہے
یہاں آرام تو مجھ کو فراغت سے نہیں ہوگا
کروں گا جا کے خود اس سے میں ساری بات، کیونکہ یہ
کبھی بھی اور کسی کی بھی وساطت سے نہیں ہوگا
کوئی اک آدھ طاقت ور تو دے سکتا ہے سر انجام
مگر ایسا کسی کمزور کثرت سے نہیں ہوگا
اب اول تو یہ ہونا ہی بہت مشکل ہے اور بالفرض
اگر ہو بھی گیا تو اتنی شدت سے نہیں ہوگا
پھر اچھی طرح تو کر بھی نہیں سکتا ہے گل ہم نے
یہ سارا کام اگر اس کی اجازت سے نہیں ہوگا
جو استعمال بھی اتنا زیادہ ہو چکا ہے گل
وہ پہلے کی طرح تو پھر مرمت سے نہیں ہوگا

وہ دے نہیں رہا تھا مجھے کوئی اہمیت
سو میں نے بھی نہیں دی اُسے کوئی اہمیت
رہتے ہیں اس لیے بھی اہم لوگوں سے الگ
اس شہر میں ہماری ہے کوئی اہمیت
جاتا نہیں اُدھر میں جہاں قدر ہی نہ ہو
پھر بات ہے اگر تو ملے کوئی اہمیت
دیتا ہوں اہمیت میں ہر اک شخص کو مگر
اس شرط پر کہ وہ بھی تو دے کوئی اہمیت
پھر وصل کے علاوہ بھی ہے ایک فائدہ
مل جاؤ اگر تم تو بڑھے کوئی اہمیت
اس شہر میں مزید ٹھہرنا محال ہے
جس میں نہیں ہمارے لیے کوئی اہمیت
بس آپ کی توجہ ہی درکار تھی ہمیں
یعنی بنانا چاہتے تھے کوئی اہمیت
کرتا ہوں گل فراز ضروری سمجھ کے میں
وہ کام جس کی اب نہیں ہے کوئی اہمیت

نہ چاہتے ہوئے بھی ایسی راہ پر نکل پڑا
میں باوجود اتنی احتیاط کے پھسل پڑا
وہ بار بار دے رہی دھمکیاں بچھڑنے کی
یہ زحمت اُس کی دی نہیں، میں خود وہاں سے چل پڑا
بھلا پرانی عادتوں سے باز کون آتا ہے
عجب نہیں جو ایسی عمر میں بھی دل مچل پڑا
ذرا سی دیر بیٹھ کیا گیا ہمارے پاس وہ
کہ اچھا خاصا جا رہا تھا سب، مگر خلل پڑا
اچانک اس طرح دکھائی وہ دیا تھا گل فراز
کہ ایک بار تو میں واقعی یہاں اچھل پڑا

لالچ اگر نہ ہو تو بھی تھوڑا ہے بہت
اس حبس میں ہوا کا یہ اک جھونکا ہے بہت
ہو جائے کامیاب تو ہے بات ہی الگ
ناکامی میں بھی ورنہ مزہ آتا ہے بہت
اک وصل جو زیادہ بھی ہو جائے تو قلیل
اور ہجر تھوڑا بھی ہو تو بن جاتا ہے بہت
بس ہاتھ ہی لگانے کا موقع نہیں ملا
ورنہ اُسے قریب سے تو دیکھا ہے بہت
پھر قدر بھی نہیں ہو گی جو سارا دے دیا
ویسے بھی اس گرانی میں یہ آدھا ہے بہت
کچھ کھو کے پانے کا تو سنا کرتے تھے، مگر
پانا تو دور ہم نے یہاں کھویا ہے بہت
پھر کام بھی تو ہم کو وہی کرنا آتا ہے
گل، جس میں نفع کم ہے، مگر گھاٹا ہے بہت
تھوڑا تو گل فراز کبھی لگتا ہی نہیں
لگتا ہے اُس کے پیچھے، تو پھر لگتا ہے بہت

گھر میں کبھی کبھار ہی جاتے رہیں اگر
اور کام رفتہ رفتہ بڑھاتے رہیں اگر
اُس کی پسند کی شے تو پھر بھی نہ آئے گی
ہم ساری عمر پیسہ کماتے رہیں اگر
یہ بات وہ سمجھ ہی نہیں سکتا ہے کبھی
آپ اُس کے ساتھ سر بھی کھپاتے رہیں اگر
تو غور کر بھی سکتا ہے درخواست پر کبھی
ہم بار بار اُس کو بلاتے رہیں اگر
مشکل تو ہے مگر اسے کر لیں گے قابو میں
یہ زور کچھ دن اور لگاتے رہیں اگر
تنگ آ کے مان لے وہ کوئی بات، کیا پتہ
یوں تھوڑا تھوڑا شور مچاتے رہیں اگر

شاعری

یہ جو رات دن معاصر مرے ساتھ چل رہے ہیں
کئی سازشی عناصر مرے ساتھ چل رہے ہیں
جنھیں مل گیا ہے موقع وہ تو کب کے جا چکے ہیں
جو ہیں بھاگنے سے قاصر مرے ساتھ چل رہے ہیں
نہیں دیکھ سکتے کچھ بھی یہ سوائے ذات اپنی
سو میں کیسے کہہ دوں ناصر مرے ساتھ چل رہے ہیں
میں ہٹا رہا ہوں خود ہی مرے راستے کے پتھر
یہ برائے نام ناصر مرے ساتھ چل رہے ہیں
جو ہوئی ذرا سی لغزش مجھے گھیر لیں گے فوراً
اسی گھات میں محاصر مرے ساتھ چل رہے ہیں

عتیق الرحمٰن صفی/گجرات

سفر کے بعد اذیت سے بھی گزارا گیا
کہیں اُترنا تھا میں نے کہیں اُتارا گیا
کبھی سیاسی، کبھی مذہبی، کبھی قومی
میں سادہ دل انہیں نعروں کی زد میں مارا گیا
وہ ٹوٹ پھوٹ کا اندر سے تھا شکار بہت
مگر مکان کو باہر سے ہی سنوارا گیا
پرانے جھگڑے فراموش کر چکا ہوگا
میں اس خیال سے ملنے اُسے دوبارا گیا
پھر اس کے بعد تو اشکوں سے بھر گئیں آنکھیں
جب اپنے نام سے عابد مجھے پکارا گیا

عابد علی/اٹک

شاعری کرنے میں آسانی نہیں
مجھ میں لفظوں کی فراوانی نہیں
میں تو اُس کی سادگی پہ مر مٹا
اُس کی نیت میں نے پہچانی نہیں
چل دیے سب چھوڑ کر تنہا مجھے
کیا جہاں والوں کی من مانی نہیں
اک پرندہ بھی نہیں تالاب پر
کیونکہ اب تالاب میں پانی نہیں
تو بتا پھر دوں تجھے کس کی مثال
کوئی بھی تیرا یہاں ثانی نہیں
کون کہتا ہے ہمارے دیس کا
قائد اعظم جناح بانی نہیں
کچھ نہیں کہتا اُسے میں اس لئے
بات جو اُس نے کبھی مانی نہیں
خاک ڈالے گا ستاروں پہ کمند
جس کے دل میں جوشِ قربانی نہیں

مقبول ذکی/بھکر

ایک دم جیسے جوانی آ گئی
خون میں دیکھو روانی آ گئی
موسمِ گل ہے تمہارے بام پر
دیکھ لو تتلی پرانی آ گئی
مائی نے تھپا جو دیکھا پانچ کاۃ
یاد آٹھانے جوانی آ گئی
تاروں پر رکھتے ہو اب اپنے قدم
کہکشاں کی حکمرانی آ گئی
پار دریا جانا ہے مجھ کو بھی اب
ہاتھ میں کوئی کہانی آ گئی
رات کٹ جاتی باتوں باتوں میں
تم کو بھی جادو بیانی آ گئی
بھر گئے ہیں یوں کٹورے آنکھوں کے
ہاتھ میں جیسے نشانی آ گئی
ایسے اُتری ہے شگفتہ ایک دم
بجلی جیسے آسمانی آ گئی

شگفتہ گل/قصور

میں بہت خاص ہوں تو بہت خاص ہے
اس لیے مجھ کو تیری بڑی آسان ہے
عشق تجھ کو یقیناً ہی دولت سے تھا
مفلسی کا سمندر مرے پاس ہے
میں نے اُس کو کہیں بس یہ کہتے سنا
یہ محبت محبت تو بکواس ہے
تو نے جانا ہے جا اے مری زندگی
یہ جو غم ہے مجھ کو بڑا راس ہے
جانتا ہوں کہ وہ بدگماں ہی سہی
پھر بھی راشد کو رشتوں کا احساس ہے

راشد ترین/

انٹرویو ڈاکٹر شہناز مزمل

ڈاکٹر شہناز مزمل کے تعارف میں اتنا بتا دینا ہی کافی ہے کہ انہیں مادرِ دبستان لاہور کہا جاتا ہے۔ تمام زندگی شعر و ادب کی خدمت میں گزاری اور گزشتہ کئی دہائیوں سے ادب سرائے کے نام سے ایک ادبی تنظیم چلا رہی ہیں جو کہ پاکستان کے شاعروں اور ادیبوں کے درمیان باہمی ملاپ اور ملاقات کا سبب ہونے کے ساتھ ساتھ ادب کی ترویج کا بھی انتہائی اہم ادارہ ہے۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ارژنگ کے قارئین کے لیے گفتگو کا موقع انہوں نے دیا۔ یہاں یہ ذکر بھی بے جا نہ ہوگا کہ یہ گفتگو ان سے عمرے کے سفر پر روانہ ہونے سے چند گھنٹے پہلے کی گئی۔

س: جائے پیدائش انسان کی شخصیت کے بارے میں بہت سارے سوالات کا جواب دیتی ہے۔ آپ کب اور کہاں پیدا ہوئیں؟

ج: میں فیصل آباد میں پیدا ہوئی تھی۔ اپریل کی ۱۰ تاریخ تھی۔

س: آپ کا شمار ان اہل حرف میں ہوتا ہے جو روایتی تعلیم میں بھی نمایاں کامیابیاں سمیٹنے میں کامیاب رہے۔ اپنی تعلیمی زندگی پر ذرا روشنی ڈالیے؟

ج: میں نے لائبریری سائنس میں ایم اے کیا تھا، پھر اس کے بعد ہالینڈ سے ڈی ایچ ایم ایس (DHMS) کیا لیکن میں سمجھتی ہوں کہ درسی تعلیم آپ کی علمی سمت کا تعین کرنے میں مدد دیتی ہے۔ مگر اصل تعلیم آپ خود ہی مطالعے سے حاصل کرتے ہیں۔

س: آپ کے اب تک بیس سے زائد شعری مجموعے اشاعت پذیر ہو چکے ہیں۔ ہمارے قارئین کی دلچسپی کے لیے آپ ان کے نام بتانا پسند فرمائیں گی؟

ج: میرے اب تک اکیس شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں، جن میں میرے نزدیک قابل فخر کام قرآن کریم کا منظوم ترجمہ ہے۔ دیگر شعری کتب میں ابتدائے عشق، عشق تماشہ، عشق مسافت، عشق مسلسل، عشق دا دیوا، عشق دا بھانبڑ، نور کل، انتہائے عشق، عشق کل، جادۂ عرفاں، بعد تیرے، قرض وفا، میرے خواب ادھورے ہیں، موم کے سائبان، جرات اظہار، جذب و حرف، پیام نو، شہناز مزمل کے منتخب اشعار، کھلتی کلیاں، مہکتے پھول، Ten poets of today۔

س: آپ نے نثر کے میدان میں بھی بہت کام کیا ہے۔ اپنی نثری کتب کے بارے میں بتائیں گی؟

ج: میری نثری کتب کی بات کریں تو علامہ اقبال کے حوالے سے میں نے کافی کام کیا ہے جو "کتابیات اقبال" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ میرا سفرنامہ "دوستی کا سفر" کے عنوان سے اشاعت پذیر ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ میری کتاب عکس خیال کافی اہم ہے اور چونکہ آپ جانتے ہیں کہ میرا شعبہ لائبریریوں کے متعلق رہا ہے، اس حوالے سے "لائبریریوں کا شہر لاہور" اور "فروغ مطالعہ کے بنیادی کردار" اہم کتب ہیں۔ بچوں کے لیے میں نے "نماز" کے نام سے کتاب تحریر کی ہے۔

س: میں نے سنا ہے آپ براڈکاسٹنگ کے شعبے سے بھی منسلک رہی ہیں؟

ج: اس حوالے سے میں صرف اتنا بتا دیتی ہوں کہ ریڈیو پاکستان کے ملتان سنٹر سے پہلی نسوانی آواز میری نشر ہوئی تھی۔

س: آپ نے پوری زندگی بطور ورکنگ وومن گزاری ہے اور اس دوران سخت محنت کی ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ ہم اہل سخن اور شعراء کرام کی شہرت پر جو کاہلی اور سستی کا میلہ داغ ہے، آپ نے وہ داغ بھی دھو دیا ہے۔ اپنی عملی زندگی کے بارے میں ذرا بتائیے؟

ج: میں نے ۱۹۸۳ء میں اپنی عملی زندگی کا آغاز کوپر روڈ کالج لاہور سے کیا اور دو سال وہاں نوکری کرنے کے بعد ماڈل ٹاؤن لائبریری کی چیف لائبریرین تعینات ہوگئی۔ تقریباً ۱۲ سال تک میں نے گورنمنٹ ماڈل ٹاؤن لائبریری میں یہ خدمات سرانجام دیں۔ پھر ۱۹۹۹ء میں بطور ریسرچ ایسوسی ایٹ (CRDC) میں دو سال لاہور سیکریٹریٹ میں شعبہ لائبریری کی بطور ڈائریکٹر کام کیا اور ۲۰۰۵ء سے اگلے چار سال قائد اعظم لائبریری میں نوکری کرتی رہی ہوں۔

س: فروغ ادب کے لیے خدمات سرانجام دینے پر آپ کو بہت سارے ایوارڈز، اسناد اور گولڈ میڈل بھی مل چکے ہیں۔ اس حوالے سے کچھ تفصیل بتایئے گا؟

ج: میرے نزدیک جو سب سے اہم ایوارڈ اور قابل فخر اعزاز جو رب کائنات نے عطا فرمایا ہے، وہ قرآن پاک کا منظوم ترجمہ و مفہوم لکھنے کی سعادت حاصل ہوئی اور الحمدللہ اس وقت میں پوری دنیا میں واحد خاتون ہوں جسے رب نے نہ صرف اس کام کے لیے چنا بلکہ ۵ سال میں ہی یہ کام مکمل کروایا جو کتابی شکل میں موجود ہے۔ بہت سی یونیورسٹیاں اور تحقیقی ادارے اس پر ریویو کر رہے ہیں۔

س: آپ کی شخصیت اور فن کے حوالے سے بہت سارا تحقیقی کام ہو چکا ہے۔ اس کی تفصیل بتانا پسند فرمائیں گی؟

ج: میرے فن اور شخصیت کے حوالے سے محترمہ نعمانہ فاروق کی کتاب "عکس خیال" اہم ہے۔ علاوہ ازیں میاں وقار الاسلام نے "مشکل کلیات" کے نام سے مجھ پر تحقیق سپرد قلم کی ہے۔ صائمہ جبیں مہک نے گزشتہ برس "تلاش حق" کے عنوان سے مجھ پر تحقیقی مقالہ لکھا ہے اور پچھلے سال ہی دعا علی کی کتاب "رمز دعا" اور "مشکل دعا" بھی شائع ہوئی ہیں۔

س: ہمیں معلوم ہے کہ آپ کو عمرے کی ادائیگی کے لیے روانہ ہونا ہے۔ اس لیے ہمیں آخر میں بس اپنی آئندہ آنے والی کتب کے بارے میں بتا دیجیے۔

ج: میری آنے والی کتب میں ایک تو "کلیات شہناز مزمل" کا غزل والیم ہے اور دوسری کتاب "کلیات شہناز مزمل" نظم ہے۔ اس کے علاوہ کلیات عشق اور سعودی عرب حجاز مقدس کے حوالے سے سفرنامہ "سفر عشق" کے نام سے شائع ہو رہا ہے۔ کالموں کا مجموعہ "اجلا کون، میلا کون" کے نام سے جلد بازار میں آنے والا ہے۔ اس کے علاوہ میری کہانیوں کا مجموعہ بھی اشاعت کے آخری مراحل میں ہے جس کا عنوان "بریف کیس" ہے۔

انٹرویو لبنیٰ صفدر

س ادب کی فی زمانہ کیا اہمیت ہے؟

ج جس طرح ماضی کے ادب سے ہمیں پچھلی دنیا کے نہ صرف حالات و واقعات سے آگاہی ہوتی ہے۔ بلکہ اس وقت کے جغرافیائی، معاشی، معاشرتی و سیاسی اُتار چڑھاؤ بھی ہم پر آشکار ہوتے ہیں۔ میں سمجھتی ہوں ادب کسی بھی معاشرے کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ماضی میں جھانکنے والا ایک روزن ہے۔ مہذب قومیں اپنے ماضی سے پیوست رہتی ہیں اور ان کو بھی فراموش نہیں کرتیں۔ زبان و بیان کی لطافتوں سے لے کر جذبات واحساسات کی واردات ہمیں بہترین ادب نے ہی مہیا کیے ہیں۔ دنیا کے اُتار چڑھاؤ میں بہت سی چیزوں میں تغیر وتبدل رونما ہوتا رہتا ہے لیکن ادب کی اہمیت و کردار کبھی نہیں بدلتے۔ آج کا حال کل کا ماضی ہوگا۔ ادب کی جو قدر و قیمت ہم نے یا ہمارے آباؤ اجداد نے محسوس کی اور اُس سے استفادہ حاصل کیا آنے والی نسلیں بھی کریں گی۔ اگر ہم مسلمانوں کی ہی بات کریں تو مسلمانوں کی یہ ادبی روایت اور اُس میں ادب کا کردار پہلی صدی ہجری سے لے کر آج تک جاری ہے۔ وہ ایک ادیب ہی تھا جس نے اعلان کیا کہ کافروں کے "الزام کے مطابق اگر حسین کافر ہیں تو ہم بھی کافر ہیں" یہی ثابت قدمی اور وفا شعاری رموزِ عشق سے آگاہ کرتی ہے۔ ادب کی اہمیت آج، کل اور ہمیشہ رہے گی۔

س کیا غزل اپنے ممکنہ امکانات تلاش کر چکی ہے؟

ج جہاں پہ تلاش کا سفر تمام ہو جائے وہاں سے نئی راہیں نکالنے کی جستجو مر جاتی ہے۔ میر و غالب نے اُردو غزل کو نیا رنگ ڈھنگ دیا۔ غزل میں متنوع موضوعات پیش کیے اور غزل عوام و خواص میں مقبول تر ہوگئی۔ پھر کے بعد دیگرے شعراء نے غزل میں نت نئے تجربات کیے۔ حسرت موہانی سے لے کر احمد فراز اور آج تک غزل میں تجربات جاری ہیں۔ امکانات تو ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔ جدیدیت نے غزل کو نئی کروٹ بٹھایا۔ غزل کے ساتھ پیش آنے والے تعصبات غزل کو نقصان نہیں پہنچا سکے۔ مختلف الموضوع ہونے کی وجہ سے اسے "نیم وحشی" صنفِ سخن قرار دیا گیا لیکن ہر دور میں ایک بڑا غزل گو شاعر پیدا ہوتا رہا جو اس کی بقا کا باعث بنتا رہا۔ ہر غزل کے پس منظر میں مسلسل سوچ اور ذہن و شعور کی کئی سطحیں کارفرما ہوتی ہیں۔ ہمہ گیر ادراک اور ذاتی تجربات غزل کے موضوعات کو وسیع کرتے رہتے ہیں۔ مختصراً یہی کہوں گی۔ امکانات کی گنجائش ہمیشہ موجود رہتی ہے اور اسی میں صنفِ سخن کی زندگی اور بقا کا راز پوشیدہ ہے۔

س آپ کے تھیسز کا عنوان "پاکستانی غزل اکیسویں صدی میں" ہے۔ اس سے متعلق قارئین کو کچھ بتائیں۔

ج ہم جدید شعرا اور غزل کو موضوعِ بحث تو بناتے رہتے ہیں لیکن جدید شعرا اور ان کے کلام کو ابھی تک کسی نے یکجا نہیں کیا تھا۔ اگرچہ چند ایک کتب مل جاتی ہیں جن میں کچھ شعرا کا کلام اکٹھا کیا گیا ہے لیکن میرے ریسرچ ورک میں دورِ جدید کے تمام اچھا لکھنے والے شامل ہیں خواہ ان کا تعلق دور دراز کے مضافات سے تھا۔ اس کے علاوہ چاروں صوبوں سے یکساں شعرا کو بغیر کسی تخصیص کے شامل کیا گیا۔ اس کے علاوہ نئے لکھنے والوں نے موضوعات اور نت نئے اسلوب اور زبان و بیان کے جو تجربات کیے اُن کو بھی اُجاگر کیا گیا ہے۔ بدلتے ہوئے حالات نے موضوعات کو بھی بدلا ہے اور نئے قوافی و ردیف سے بھی آشنائی فراہم کی ہے۔ ہر شاعر کے کلام کے ساتھ اس کا مختصر تعارف بھی پیش کیا گیا ہے جو کہ اس کی موجودہ رہائش اور کام کے متعلق ہے۔ یہ لسٹ سینکڑوں میں ہے جن کا تعارف نہیں دیا جا سکا۔ ان کے اشعار بطور تعارف دیے گئے ہیں۔ کیونکہ لسٹ اتنی طویل ہوگئی تھی کہ سب کے بارے میں تفصیل سے لکھنا دشوار تھا۔ ادب کے قاری کے لیے اس ریسرچ ورک میں نہ صرف جدید شعرا کا مکمل تعارف بآسانی دستیاب ہے بلکہ 70 کی دہائی کے بعد لکھنے والے تمام اہم ناموں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ اس طرح ایک تو غزل کے فی زمانہ بدلتے ہوئے رنگ و آہنگ کو پہچانا جا سکتا ہے۔ بلکہ غزل کو جدیدیت کے ساتھ اکیسویں صدی تک لانے والے تمام شعراء کے کلام سے استفادہ بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔

س تراجم کی کیا اہمیت ہے۔ ماضی میں غیر ملکی ادب جس مقدار میں اُردو میں ترجمہ ہوا اب ویسی صورت حال نظر نہیں آتی۔ اس کی کیا وجوہات ہیں؟

ج تراجم کا آغاز فورٹ ولیم کالج سے ہوا اور اُس کی وجہ اُردو ادب میں کتب کا بہت کم ذخیرہ ہوتا تھا۔ اُر دو کتب نایاب تھیں۔ لہٰذا دوسری زبانوں سے بے شمار کتب کو اُردو میں ترجمہ کیا گیا جس سے اردو دان کو دلچسپی پیدا ہوئی۔ وہ کتب آج بھی دلچسپی سے پڑھی جاتی ہیں۔ پھر وقتاً فوقتاً دیگر زبانوں سے تراجم کا سلسلہ جاری رہا۔ اس طرح دوسرے ممالک میں تخلیق کیے گئے ادب اور ادبی رجحان سے قاری کو آشنائی ہوئی۔ اس طرح آپ اپنے اور دوسری زبانوں میں ادبی توازن کا موازنہ بھی کر سکتے ہیں۔ نت نئے امکانات اور موضوعات کو جانتے ہیں۔ تخلیقی عمل میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور دلچسپی بھی۔ ماضی قریب میں ترجمہ کو دوئم درجہ کا کام مانا جاتا تھا اور اسے تخلیقی و ادبی کام ماننے سے بھی گریز کیا جاتا تھا لیکن اب خیالات بدل چکے ہیں۔ لوگوں نے سمجھ لیا ہے کہ اس طرح دوسری تہذیبوں، روایات اور ثقافت سے متعارف ہوا جا سکتا ہے۔ پھر ایک انسانی گروہ کے تجربات

دوسرے انسانی گروہ تک پہنچتے ہیں۔ اس کے علاوہ صرفی ونحوی ساخت سے آگاہی ہوتی ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اُردو کو ایک باقاعدہ زبان کے مقام پر فائز کرنے میں بھی تراجم کا بہت اہم کردار رہا ہے۔ اگر سقراط/ افلاطون اور دیگر قیمتی کتب کا عربی زبان میں ترجمہ نہ ہوتا تو یہ قیمتی سرمایہ روم و یونان کے پرانے کھنڈرات میں دب کر کبھی کا فنا ہو چکا ہوتا۔ آج بھی نہ صرف ادبی کتب کے تراجم ہو رہے ہیں بلکہ کاروباری حضرات بھی اپنی مطلوبہ کتب کے تراجم کرواتے ہیں۔

مقتدرہ جامعہ کراچی اور جامعہ پنجاب کا وسیع کام لائبریریوں میں موجود ہے۔ ترجمہ شدہ کتب کو پڑھانے کے لیے ایک مخصوص فضا کو قائم کرنے کی ضرورت ہے۔

س: کیا ادیب کو روایت شکن ہونا چاہیے یا روایت پرست؟

ج: روایت شکنی کا آغاز تحریک علی گڑھ سے ہو چکا تھا۔ ۱۹۱۷ء کے انقلاب نے ہندوستان پر بھی اپنے اثرات مرتب کیے اور ڈاکٹر صوفی گھوش، ملک راج آنند، ڈاکٹر محمد دین تاثیر اور سید سجاد ظہیر اس تحریک کا حصہ بنے۔ ہٹلر نے جب ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کو قید کیا تو اس کے اثرات فاشزم کی صورت میں پوری دنیا کے ادب پر بھی اثر انداز ہوئے۔ ہندوستانی ادباء نے بھی محسوس کیا کہ پچھلی دو صدیوں میں جو ادب کی تخلیق عمل میں آئی ہے وہ ہماری تاریخ کا انحطاطی دور ہے۔

اب ادب کو زندگی کا آئینہ دار بنانے کا دور تھا۔ ترقی پسند تحریک نے روایات اور قدامت کے بت کو پاش پاش کیا۔ ادب خود کو معاشرے سے الگ نہیں رکھ سکتا۔ لہٰذا ایک ادیب کو وقت کے ساتھ خود کو بدلتے رہنا چاہیے۔ ادیب بننے کے لیے کسی حد تک روایت پرست ہونا چاہیے لیکن بڑا ادیب بننے اور خالص اور اعلیٰ ادب کی تخلیق کے لیے روایت شکن ہونا بھی ضروری ہے۔ روایت پرستی ٹھہرے ہوئے تالاب کی مانند ہے جس پر کائی جم جاتی ہے۔ جبکہ روایت شکنی بہتے ہوئے پانیوں جیسی ہے۔ اسی طرح ادب اور خاص طور پر شاعری پر جو جمود طاری ہے قدیم موضوعات کو آج بھی من و عن پیش کیا جا رہا ہے۔ اس میں بھی جدت لانے کی مزید ضرورت ہے۔ نہ صرف شاعری کے موضوعات بلکہ ہیئت کے نئے تجربات بھی ہونے چاہئیں۔

س: تنقید کسی بھی تخلیق اور تخلیق کار کے لیے فائدہ مند ہے یا نقصان دہ؟

ج: تنقید کا مقصد کسی بھی ادبی پارے کی صحیح اور مکمل تفہیم ہے۔ اگر فن پارہ اعلیٰ اور معیاری ہے تو اس کی تحسین ہونی چاہیے اور اگر اس میں کچھ سقم باقی ہے تو ان کی نشاندہی کر کے تحریر کو مزید بہتر بنانے کی تجاویز دی جا سکتی ہیں۔ اگر چہ تنقید برائے اصلاح ہو نہ کہ تنقید برائے تنقید۔

قدیم و جدید دونوں تنقید کا یہی منصب بھی رہا ہے اور مقصد بھی۔ مولانا حالی نے مقدمہ شعر و شاعری سے جدید تنقید کا آغاز کر دیا تھا۔ شاعری کی طرح تنقید میں بھی نت نئے امکانات کی گنجائش ہمیشہ باقی رہی ہے۔ تنقید کا مطلب بھی ''کھرے اور کھوٹے کو پرکھنا'' ہے۔ تنقید اور تخلیق دراصل ایک دوسرے کے لیے مشعل راہ ہیں۔ ارسطو کی ''بوطیقا'' صدیوں تک تخلیق فن کے لیے مشعل راہ بنی رہی۔ تنقید کا مقصد صرف تخلیقات کا محاکمہ کرنا نہیں بلکہ تخلیق کے اصول دریافت کرنا بھی ہے۔ انصاف پر مبنی تنقید فن کو سنوارتی ہے اور فنکار کی رہنمائی اور اصلاح کا فریضہ سرانجام دیتی ہے۔ تنقید کا مقصد حوصلہ شکنی ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ حوصلہ افزائی اور رہنمائی ہے۔ لہٰذا بامقصد اور مبنی برانصاف تنقید تخلیق اور تخلیق کار دونوں کے لیے سود مند ہے۔

س: اردو غزل میں اتنی مایوسی اور اُداسی کیوں ہے؟

ج: عاشق اور معشوق روز اوّل سے اردو غزل کے دو اہم کردار رہے ہیں جہاں عشق کی کیفیات ہوں وہاں ہجر و فراق کے قصے بھی ہوتے ہیں۔ ہماری زیادہ تر شاعری چونکہ عشق و محبت کے قصوں پر مشتمل ہے تو غم والم کے واقعات و احساسات بھی اس کا حصہ بنے اور آج تک بنے ہوئے ہیں۔ غالب نے میر کے تصور مایوسی اور رنج والم کو اپنی خوش طبعی کے باعث توڑا۔ رنج والم کے مضامین کو بھی ہلکے پھلکے انداز میں اس طرح پیش کیا کہ دل میں درد رکھنے والے بھی زیر لب مسکرا کر اس سخن کا مطالعہ کرنے لگے۔ دوسرے معاشی و سماجی حالات و واقعات کے ساتھ سیاسی حالات بھی شاعر کے مزاج پر اثر انداز ہوئے۔ یہ حقیقت ہے کہ سماجی و سیاسی حالات ادب و شاعر کو لاشعوری طور پر متاثر ضرور کرتے ہیں اور اس کی تحاریر کا حصہ بن جاتے ہیں۔ غزل جدید دور میں داخل ہوئی تو جام و مینا اور گل وبلبل کے فرضی تصورات سے نکلی۔ اب زندگی کی ٹھوس حقیقتوں سے سامنا کرنے کا وقت تھا۔ الغرض قیام پاکستان سے لے کر سقوط ڈھاکہ اور افغانستان سے لے کر روس کے زوال تک ہر رنج و غم کو بھی غزل نے اپنے دامن میں سمیٹا۔ ۶۵ اور ۷۱ کی جنگوں کا اثر بھی شاعری میں نظر آتا ہے۔ ۷۰ کی دہائی میں کچھ شعرا کے ہاں اساطیری، مذہبی اور تہذیبی رجحان نمایاں ہے۔ جس میں جنگ و جدل، وطن سے دوری اور مذہبی و تہذیبی انحطاط کے مضامین کثرت سے موجود ہیں۔ لہٰذا مایوسی اور اُداسی کا رنگ ان وجوہات کی وجہ سے آج بھی غزل پر نظر آتا ہے۔ اُمید اور حوصلہ کی فضا اگر چہ بہت کم کم ہے اور اس کے رنگ ابھی مدھم ہیں لیکن نوجوان نسل کے ہاں اُمید کی کمی بھی نہیں ہے۔

س: کیا آپ پاکستانی اُردو غزل کو ہماری تہذیب و ثقافت کا آئینہ دار سمجھتی ہیں؟

ج: جی ہاں بالکل سمجھتی ہوں۔ ہر ادیب اور شاعر اپنے معاشرے کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ جیسے دوسری زبانوں کا ادب پڑھنے سے ہمیں وہاں کی تہذیب و ثقافت کا پتہ چلتا ہے۔ اسی طرح اُردو ادب نے بھی

کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ انگریزی سے اُردو میں رواج پائی۔ دراصل حقیقت کچھ اور ہے۔ ٹیگور کی ''گیتا نجلی'' کے توسط سے ہی انگریزی شاعری میں نثری نظم تشکیل پائی۔ نثری نظم آہستہ آہستہ ہماری روایت کا حصہ بنتی جا رہی ہے۔ جس طرح آزاد نظم کو شروع میں مسائل کا سامنا رہا۔ بعد میں قاری نے اسے اپنایا تو اس میں بڑے شعرا پیدا ہوئے۔ یقیناً نثری نظم کو اپنانے کے بعد اس میں بھی بڑے شعرا اُبھر کر سامنے آئیں گے۔

س کیا اُردو زبان کی عمر ۱۵۰۔۲۰۰ برس رہ گئی ہے۔ جیسا کہ ہمارے کچھ ادیب کہہ رہے ہیں۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

ج یقیناً حالات پہلے سے بدلے ہیں۔ ذریعہ تعلیم زیادہ تر انگریزی میں ہے اور انگریزی لکھنے پڑھنے اور بولنے والوں کو مہذب سمجھنے کی سوچ ہمارے ہاں کافی پختہ ہے۔ پھر تیز رفتار ترقی کا مقابلہ کرنے اور ترقی یافتہ ممالک کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کے لیے انگریزی کی اہمیت کو بہت زیادہ خود پر طاری کر لیا گیا ہے۔ اُردو دان اگرچہ کم ہوئے ہوں گے۔ مگر حالات اتنے بھی حوصلہ شکن ہرگز نہیں ہیں۔ آج بھی کروڑوں لوگ اُردو بولتے اور سمجھتے ہیں اور ایسا صرف پاکستان میں ہی نہیں ہے بلکہ دیگر ممالک کی یونیورسٹیز میں اُردو کے شعبے کام کر رہے ہیں۔ اردو زبان شوق سے سیکھی جاتی ہے۔ اگر اُردو متروک ہونے والی ہوتی تو کئی ممالک میں اُردو کے شعبے اس جاں فشانی سے کام نہ کر رہے ہوتے۔ ہماری یونیورسٹیز میں لاکھوں طلبا اُردو لٹریچر پڑھ رہے ہیں۔ بی اے تک اُردو لازمی تعلیم کے طور پر آج بھی پڑھی جا رہی ہے۔ یہ ہماری قومی زبان ہے۔ دور دراز اور پسماندہ علاقوں میں بھی لوگ اُردو کو آسانی سمجھ لیتے ہیں۔ جبکہ انگریزی کو سمجھنے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔ تو ایسی صورت میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اُردو ختم ہونے والی ہے۔ آج بھی اُردو کی ہزاروں کتابیں چھپ رہی ہیں اور ان کو خریدنے اور پڑھنے والے بھی موجود ہیں۔ انگریزی اور دوسری زبانوں کی کتنی کتب چھپ رہی ہیں؟ اُردو دنیا کی تیسری بڑی عالمی رابطہ زبان ہے۔ اسے آسانی ختم نہیں کیا جا سکتا۔

س کیا ادبی رسائل کی اہمیت اب ختم ہو چکی ہے اور اس کی جگہ سوشل میڈیا نے لے لی ہے؟

ج اگرچہ سوشل میڈیا نے جہاں اور کئی نقصانات پہنچائے ہیں وہیں ادب میں بھی کئی تبدیلیاں آئی ہیں۔ آج ایک کلک پر قاری کو ہر طرح کا مواد پڑھنے کے لیے بآسانی دستیاب ہے۔ سفر کے دوران، انتظار گاہوں میں، پارکوں اور دفتروں میں وہ جہاں چاہے اپنی پسندیدہ کتب یا رسائل کا مطالعہ آسانی کر سکتا ہے۔ ایسا زیادہ تر نوجوان نسل میں ہے۔ لیکن پرانے اور نئے بہت سے لوگ اب بھی کتب بینی کے شائق ہیں اور ان کا ماننا ہے کہ جو مزہ کتاب سے پڑھنے میں ہے وہ سوشل میڈیا پر نہیں ہے۔ اگرچہ سوشل میڈیا پر بے بہا غیر معیاری ادب نے اپنی جگہ بنا لی ہے لیکن معیاری اور ادبی رسائل سالوں سے اپنی اہمیت آج بھی برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آج بھی بے شمار ادبی جرائد شائع نہ ہو رہے ہوتے۔ یہ ہوا ہے کہ سوشل میڈیا پر بغیر اُجرت کے پڑھنے والوں کو جرائد و کتب خرید کر پڑھنا دشوار لگتا ہے۔ خریدنے کا رواج کم ہو گیا ہے لیکن ادبی رسائل آج بھی تواتر سے شائع ہو رہے ہیں اور قاری تک پہنچ رہے ہیں۔

س کتاب کا مستقبل آپ کیا دیکھ رہی ہیں؟

ج جی جیسا کہ ادبی رسائل کے حوالے سے گفتگو ہو چکی ہے یہی حال کتب کا بھی ہے۔ سوشل میڈیا کی وجہ سے کتب خرید کر پڑھنے کا رواج کم ہوتا چلا جا رہا ہے۔ آج مصنف کتاب کو تحفے میں دینے پر مجبور ہے۔ کیونکہ مارکیٹ میں کتابیں اب اُس طرح سے فروخت نہیں ہوتیں جیسی آج سے چند برس قبل ہوا کرتی تھیں۔ کتاب کا مستقبل زیادہ محفوظ نہیں ہے۔ فٹ پاتھوں پر نہایت ارزاں نرخ پر کتابیں اپنے قاری کی منتظر نظر آتی ہیں۔

س آپ نوائے وقت کی مستقل کالم نگار ہیں۔ ایک اچھے کالم کی کیا خوبیاں ہوتی ہیں؟ اور کالم نگار میں کیا خوبیاں ہوں؟

ج دوسری اصناف کی طرح کالم نگاری میں بھی جدت آئی ہے۔ اب ہر موضوع کو کالم میں سمویا جا سکتا ہے۔ سیاسی، معاشی، معاشرتی، مذہبی، علاقائی، اخلاقی غرض ہر طرح کی بات کالم میں آسانی کہہ کر لاکھوں لوگوں تک پہنچائی جا سکتی ہے۔ نہ صرف ملکی بلکہ بین الاقوامی حالات و واقعات کا بھی بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ تو ایک اچھے کالم نگار کی پہلی خوبی تو یہ ہے کہ وہ ہر طرح کے حالات و واقعات پر کڑی نگاہ رکھے۔ میں سمجھتی ہوں قلم کا جہاد بہت طاقتور ہے۔ حق اور سچ کی بات کہہ کر کالم نگار مکمل جہاد کرتا ہے۔ حقائق تلخ ہوں بغیر خوف و خطر اپنے نظریات کا اظہار کرنا چاہیے۔ ہمارے ملک میں صحافت آزاد ہے۔ اب زرد صحافت کا دور نہیں رہا۔ کچھ بھی کہنے اور لکھنے کی مکمل آزادی ہے۔ یہ بہت بڑی خوبی ہے۔ ایک اچھا کالم لکھنے کے لیے موضوع کا انتخاب بہت اہمیت کا حامل ہے۔ بات مدلل اور اہم ہو۔ قاری کو سمجھنے میں دقت پیش نہ آئے۔ تلخ بات کو بھی نرم اور مہذب انداز میں کہنا چاہیے۔

س کہا جاتا ہے کہ کالم کی عمر ایک دن ہوتی ہے۔ تو کیا آپ اس سے متفق ہیں؟

ج ہر روز جتنی تیزی سے دنیا کے حالات اور واقعات بدلتے ہیں اتنی ہی تیزی سے خبروں کا سٹیریو بھی بدل جاتا ہے۔ ہر روز نیا واقعہ نیا مسئلہ ہوتا ہے جس پر ہمیں غور و فکر بھی کرنا پڑتا ہے اور اس کا مناسب حل بھی تلاش کرنا پڑتا ہے۔ صرف کالم ہی نہیں شاید ہر خبر کی مدت آج ایک ہی دن ہوتی ہے۔ لیکن دوسری طرف بہت سے کالم جہاں شوق سے پڑھے جاتے ہیں وہیں ان میں فکر و بچار کے پہلوؤں کو یاد رکھا جاتا

ہے۔ ضروری نہیں کہ کالم کو شعر کی طرح یاد رکھا جائے۔ نفس مضمون اور کہنے والے کا نظریہ یاد رہنا چاہیے۔ ایک بات لاکھوں لوگ پڑھتے ہیں اور ہر چیز اپنا لاشعوری طور پر اثر تو چھوڑ ہی جاتی ہے۔ تو یہی چھوڑے ہوئے اثرات ہی کالم کی زندگی ہیں ان کہ الفاظ اور محض نفس مضمون۔ بعض اوقات کالم کی ایک سطر پوری کتاب کا خلاصہ بن جاتی ہے۔

س: کیا کالم جلدی میں لکھا جانے والا ادب ہے۔ عموماً یہی کہا جاتا ہے۔ کیا یہ واقعی ادب کی صنف ہے یا نہیں؟

ج: جو کالم نگار روزانہ کی بنیاد پر کالم نویسی کو ایک پیشہ کی صورت اختیار کر کے لکھنا شروع کر دیتے ہیں اسے تو واقعی جلدی میں لکھا جانے والا ادب ہی کہا جائے گا۔ اس طرح معیار پر بھی برا اثر پڑتا ہے۔ اچھا اور معیاری کالم لکھنے کے لیے گہرے مشاہدہ اور مطالعہ کی ضرورت درپیش ہوتی ہے۔ نیز الیکٹرک میڈیا سے نشر شدہ خبروں اور تجزیوں کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے۔ کالم کے لیے وقت اور مطالعہ دونوں چاہئیں۔ میں سمجھتی ہوں کالم لکھنا آسان نہیں ہے بلکہ ہمیشہ مشکل ہے۔ اگر واقعی آپ کالم نگاری سے انصاف کر رہے ہیں۔ کالم میں چونکہ ذاتی رائے ہوتی ہے آپ اسے مضمون کی صورت دے دیتے ہیں۔ ہم نے چونکہ صرف سیاسی حالات پر ہی لکھنے کو کالم تسلیم کر لیا ہے۔ اگرچہ دوسرے ممالک میں ایسا نہیں ہے۔ اس میں ادبی مضامین و دیگر بھی ہوتے ہیں جن کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ لہٰذا اسے ادب کی صنف قرار دیا جا سکتا ہے۔ ابن انشا نے فکاہیہ کالم لکھے۔ بعض اوقات ایک کالم مکمل ادبی شہ پارہ ہوتا ہے۔ ہمارے نامور قدیم ادباء نے بھی کالم لکھے۔

س: کیا شاعر کی طرح کالم نویس بھی پیدائشی ہوتا ہے؟

ج: میں سمجھتی ہوں کہ شاعر ہو یا رائٹر وہ پیدائشی ہی ہوتا ہے۔ لکھنے کی صلاحیت محض سیکھنے سے پیدا نہیں ہو سکتی۔ آپ شاعری کر رہے ہیں یا ادب میں کچھ اور تخلیق کر رہے ہیں تو بنیادی چیز تخیل ہے۔ کالم میں بھی مشاہدہ اور تخیل اکٹھے ہوتے ہیں۔ آپ اپنی تخیل کی آنکھ سے ان چیزوں کو بھی دیکھ لیتے ہیں جو عام انسان کی آنکھ سے اوجھل رہتی ہیں یا اُس طرف ان کی توجہ نہیں جاتی۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگوں کا مشاہدہ بہت اچھا ہو۔ وہ غور و فکر سے چیزوں کی حقیقت سے بھی آشنا ہوں لیکن یہ ضروری نہیں کہ ان خیالات کو لکھنے کی صلاحیت بھی ان میں موجود ہو۔ لکھنا ایک خداداد صلاحیت ہے۔ آپ کے اس تخیل، الفاظ اور ویژن کا خزانہ موجود ہو تو ہی آپ کچھ لکھ سکتے ہیں۔ الفاظ کی بناوٹ کے لحاظ سے مدلل نفس مضمون کو بیان کرنا فطری صلاحیت ہے۔

س: ہمارے اکثر شعراء نے کالم نویسی شروع کر دی ہے۔ کیا وہ اپنی شاعری سے غیر مطمئن ہیں یا جلد شہرت چاہتے ہیں؟

ج: دیکھیں جیسا کہ میں نے کہا کہ لکھنا ایک قدرتی صلاحیت ہے۔ شاعر کی طرح کالم نویس بھی پیدائشی ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ایک اچھا شاعر ایک اچھا کالم نویس تو بن سکتا ہے لیکن ایک اچھا کالم نویس ایک اچھا شاعر نہیں بن سکتا۔ اس لیے شعراء نے کالم نویسی بھی شروع کر دی ہے۔ کیونکہ ان میں لکھنے کی صلاحیت قدرے زیادہ ہوتی ہے۔ غزل اور دیگر شاعری چونکہ محدود موضوعات کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور کالم میں نہ صرف آپ ہر طرح کے مضمون پر کھل کر اظہار خیال کر سکتے ہیں بلکہ آپ نتائج، نظریہ اور حل بھی ایک ہی تحریر میں پیش کر دیتے ہیں۔ جبکہ شاعری میں ایسا کرنا ممکن نہیں ہے۔ شعرا شاعری سے غیر مطمئن نہیں ہیں بلکہ وہ زیادہ سے زیادہ اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے لیے دیگر اصناف میں بھی طبع آزمائی کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح کالم میں وسیع سطح پر خیالات کا اظہار انہیں ذہنی تسکین بہم پہنچاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ شہرت کی خاطر ایسا کرتے ہوں تو اگر وہ اچھا کام کر رہے ہیں تو شہرت حاصل کرنے کی خواہش میں قباحت بھی کیا ہے اور یہ خواہش کس شاعر کو نہیں ہوتی خواہ وہ کالم نہ بھی لکھ رہے ہوں۔ دوسری طرف زیادہ طبقہ شاعری سے زیادہ اخبار اور کالم پڑھنے کو ترجیح دیتا ہے تو ایسے میں یہ ایک اچھا میڈیم ہے۔

س: ہمارے ادبی ماحول میں ایک شاعرہ کو نام بنانے کے لیے کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟

ج: خواتین کو جہاں دوسرے شعبہ جات میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اسی طرح ادبی ماحول میں اپنی شناخت بنا کر چلنا بھی اُتنا ہی مشکل ہے۔ ماحول خواہ پہلے سے زیادہ ایڈوانس ہو چکا ہے۔ بظاہر لگتا ہے عورت پہلے سے زیادہ آزاد فضا میں سانس لے رہی ہے لیکن ابھی تک اُسے گھرداری کی ذمہ داریوں میں کئی شوق قربان کرنے پڑتے ہیں۔ ابھی تک مرد اُس کی ذاتی حیثیت کو تسلیم کرنے سے انکاری ہے۔ اس کا کردار گھر، مرد اور بچوں تک ہی محدود سمجھا جاتا ہے۔ بظاہر کامیاب لکھاری عورت کی ذاتی زندگی میں جب آپ جھانکیں گے تو پتہ چلتا ہے کہ اس نے اس مقام تک آنے کے لیے بہت کچھ سہا ہے۔ سب کچھ جتنا آسان نظر آتا ہے اتنا ہوتا نہیں ہے۔ جس طرح ملازمت کے لیے باہر نکلتے وقت عورت کو مرد کی مختلف ذہنیت سے واسطہ پڑتا ہے خاص طور پر جہاں وہ مردوں کے ساتھ کام کر رہی ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح ادبی ماحول میں بھی اُسے درپیش ہے۔ ادبی دنیا میں مرد کا ذہن اور سوچ میں کوئی تبدیلی نہیں۔ اُس کی ذہنی اپروچ خاص طور پر عورت کے حوالے سے ایک عام مرد کی سوچ سے قطعاً مختلف نہیں ہے۔ ایک جینوئن شاعرہ کو اپنی جگہ بنانے کے لیے نہایت احتیاط سے سوچ سمجھ کر ہر قدم اُٹھانا پڑتا ہے۔ دھیرے دھیرے صبر اور حوصلے کے اس سفر کے بعد وہ اپنے کام سے اپنا نام بنانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔

س: بطور شاعرہ اُسے صنف نازک ہونے کی وجہ

سے رعایتی نمبر بھی تو ملتے ہیں؟

ج: آپ کسی جینوئن رائٹر یا شاعرہ کے لیے ایسا نہیں کہہ سکتے۔ وہ اگر اپنی جگہ بناتی ہے تو محض اپنے کام اور اپنی محنت کی وجہ سے۔ آج جن کا نام ہے ان کے کام کو سراہا جاتا ہے اور تسلیم کیا جاتا ہے۔ آپ بتائیں کہ کتنی نان جینوئن شاعرات ہیں جنھوں نے شہرت حاصل کی اور پھر یہ شہرت تادیر قائم بھی رکھ سکیں۔ رعایتی نمبر انہی متشاعرات کو ملتے ہیں جن کو مقبول کرنے میں خاص ادبی گروہ یا مبنی بر مفادات رکھنے والے کسی شاعر کا ہاتھ ہوتا ہے۔ میں زیادہ اس تفصیل میں نہیں جانا چاہتی لیکن رعایتی نمبرز متشاعرات کے حصے میں ہی آتے ہیں۔ آج کا قاری خاصا باشعور ہے۔ وہ اچھا کلام پڑھتا ہے اور اسے داد دیتا ہے۔ آج ہماری بہترین شاعرات کو نمبرز اُن کے صنف نازک ہونے کے باعث نہیں ملے۔ انہوں نے اپنے کام سے خود کو منوایا ہے۔

س: اپنے خاندانی پس منظر، تعلیم اور ادبی سفر سے متعلق قارئین کو کچھ بتائیں۔

ج: میرا تعلق سرگودھا کی جٹ زمیندار فیملی سے ہے۔ میرے والد صاحب مرے کالج سیالکوٹ کے پڑھے ہوئے تھے۔ باقی افراد بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اچھے عہدوں پر فائز ہیں۔ میری والدہ بھی پڑھی لکھی ہیں۔ لہٰذا گھر کا ماحول والد صاحب کے حوالے سے ادبی بھی رہا۔ کلام اقبال کا زیادہ تر حصہ انہیں زبانی یاد تھا۔ زمیندار تھے، مزارع رکھے ہوئے تھے۔ لہٰذا وقت کی فراوانی کی وجہ سے ان کا زیادہ وقت مطالعہ میں گزرتا۔ کچھ وراثت اور کچھ گھر کے ماحول کی وجہ سے پڑھنے اور لکھنے کا شوق قدرتی طور پر تھا۔ ایم اے اردو پنجاب یونیورسٹی سے کیا۔ پھر منہاج یونیورسٹی سے ایم فل اُردو کی ڈگری حاصل کی۔ اس سے قبل بی ایڈ، ایم ایڈ اور کمپیوٹر سائنسز میں بھی ڈگریاں لیں۔ ایل ایل بی کیا اور بعد ازاں بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد سے شریعہ لا میں ڈپلومہ بھی حاصل کیا۔ رجحان زیادہ اردو لٹریچر کی جانب تھا۔ اسی وجہ سے ایم فل کیا۔ ادبی سفر کا آغاز تو شاید چھٹی کلاس سے ہو چکا تھا۔ بے ساختہ بچوں کے لیے نظمیں لکھنی شروع کر دیں۔ کبھی آسمان اور ستاروں پر کبھی موسموں پر۔ پھر مختصر اقتباسات لکھے۔ مختلف جرائد میں تحریریں بھیجیں اور سالوں تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ اسی دوران ایک مقامی پرچے کے لیے فیچرز اور کالم بھی لکھے۔ مختصر افسانوں کا بھی شوق رہا اور کچھ مختلف پرچوں میں چھپے۔ ۲۰۰۳ء میں شاعری کی پہلی کتاب ''تمہیں تو میرا ہونا تھا'' منظر عام پر آئی۔ یکے بعد دیگرے پانچ مزید کتب شائع ہوئیں جن میں ''محبت آئینہ کر لو'' یہ ہجر ہے یا وصال ہے۔ بارشوں کے موسم میں، خوشبو ہے وہ صندل کی اور تم محبت کا استعارہ ہو، شامل ہیں۔ کافی عرصہ سے نوائے وقت کی مستقل کالم نگار ہوں۔ عامر بن علی اور حسن عباسی کے ساتھ ماہنامہ ارژنگ کے لیے کام کرتی ہوں۔

س: کیا ادیب یا شاعر کی تخلیقات کو اس کی اپنی زندگی کا ترجمان ہونا چاہیے یا معاشرے کا؟

ج: اگرچہ لکھنے کا آغاز ذاتی کیفیات کے کتھارسس کے لیے ہوتا ہے لیکن ایک حساس شاعر یا ادیب اپنے اردگرد ہونے والے مسائل کو بھی اُسی شدت سے محسوس کرتا ہے جس طرح اپنے ذاتی غم یا مسائل کو۔ اگر ایک ادیب اپنے ذاتی تجربات کو تحریر میں سموتا ہے تو یقیناً ایسے تجربات یا حالات سے اور بھی بے شمار لوگ گزر چکے ہوتے ہیں گزر رہے ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے پڑھنے والے کو وہ اپنی کہانی محسوس ہوتی ہے۔ ذاتی وجوہات کے باوجود ایک غم یا ایک خوشی بعض اوقات پورے معاشرے یا ایک بڑے طبقے کی نمائندگی بھی کرتی ہے۔ ایک اچھے ادب کو تخلیق کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اپنی ذات کے خول سے باہر آ کر کائناتی وسعتوں میں پھیلے ہوئے درد و غم کو محسوس کیا جائے اور اپنی تحاریر کے ذریعے لوگوں تک پہنچایا جائے۔ بہت سے لوگ تحریر کے ذریعے اپنی بات یا دکھ کہنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ ایسے میں ادیب پر اپنے علاوہ معاشرے کی ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں۔ ہمارا بہترین ادب ایسے افسانوں، ناولوں اور شاعری پر مشتمل ہے جس میں ذاتی نہیں معاشرتی عکاسی کی گئی ہے۔ میں سمجھتی ہوں ہر اچھے لکھاری نے اپنے گرد ہونے والے حالات و واقعات سے متاثر ہو کر لکھا ہے۔ ۶۵ اور ۷۱ کی تحاریر دیکھ لیں۔ اس کے علاوہ مختلف تحریکوں کے ذریعے تخلیق ہونے والا ادب نہ صرف اپنے معاشرے بلکہ سرحدوں کی قید سے نکل کر تشکیل پایا۔ علامہ اقبال کی شاعری سے بڑی کیا مثال ہوگی۔ لہٰذا بہترین ادیب کو ذاتی واردات سے آگے کا سوچ کر معاشرتی مسائل کا ترجمان ہونا چاہیے۔

س: نئے لکھنے والوں کے لیے چند مفید مشورے جس سے اُن کو مستقبل سے فائدہ ہو۔

ج: اچھا لکھنے کے لیے مطالعہ بہت ضروری ہے۔ آپ کی تمام صلاحیتیں اور آپ کا عمدہ تخیل بھی اُس وقت تک بے کار ہے جب تک آپ دوسرے ادبا اور شعرا کا مطالعہ نہیں کرتے۔ اس سے آپ کا نہ صرف وژن بہتر ہوتا ہے بلکہ آپ کو پتہ چلتا ہے کہ اچھے ادیب کی کیا خوبیاں ہیں۔ نئے لکھنے والوں کے لیے یہی کہنا چاہوں گی کہ کتب بینی کی عادت اپنائیں۔ اپنے سینئرز کے ساتھ بیٹھیں، ان سے بات کریں۔ یقین کریں ایک عالم کے ساتھ بیٹھ کر گفتگو کرنا کئی کتابیں پڑھنے سے بہتر ہے۔ اس کے علاوہ اگر کچھ لکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں تو کسی کو دکھاتے رہیں اور مزید بہتر کرنے کے لیے مشورے لیتے رہیں۔ سیکھنے سے تحاریر میں نکھار پیدا ہوتا ہے۔

تبصرۂ کتب

نام کتاب : ایسا تھا میرا کراچی/مصنف : محمد سعید جاوید/سن اشاعت : 2019ء/ قیمت : 1400 روپے

ناشر : بک ہوم، بک سٹریٹ 46-مزنگ روڈ لاہور

زیر نظر کتاب ''ایسا تھا میرا کراچی'' محمد سعید جاوید کی تصنیف ہے۔اس سے پہلے مصنف کی دو کتابیں خود نوشت ''اچھی گزر گئی۔۔۔'' اور سفرنامہ ''مصریات'' شائع ہو کر قارئین سے پذیرائی حاصل کر چکی ہیں۔ مصنف نے کراچی یونیورسٹی سے تعلیم مکمل کی اور ملازمت کے ابتدائی دور میں پاکستان کے مختلف اداروں میں کام کیا اور بعد میں حبیب بینک میں شمولیت اختیار کی۔9 سال بینک میں منیجر کی حیثیت سے ذمہ داری سنبھالی اس کے بعد اگلے 25 سال میں وطن سے دور ایک امریکی تعمیراتی کمپنی جے اے جونز میں مالیاتی شعبے کی سربراہی کی۔پھر دنیا کے سب سے بڑے اور جدید کنگ فیصل اسپیشلسٹ ہسپتال ریاض میں مالیاتی اور انتظامی امور نبٹائے اور غیر ملکی ماہرین کی نگرانی میں اپنی تعلیم اور تجربے کو وسیع اور بہتر کیا۔وطن واپسی پر لاہور کے سب سے جدید ہسپتال میں بطور سینئر ایڈمنسٹریٹر تعینات ہوئے چار سال وہاں خدمات سرانجام دیں۔

زیر نظر کتاب ''ایسا تھا میرا کراچی'' محمد سعید جاوید کی شہر قائد کراچی کی یادداشتوں پر مشتمل ایسی تصنیف ہے جس میں انہوں نے اپنے بچپن، لڑکپن اور جوانی کے یادیں بیان کی ہیں۔یہ آپ بیتی بھی ہے اور جگ بیتی بھی۔یہ 1951 سے 70ء کی دہائی تک کی کہانی ہے وہ کراچی جسے روشنیوں کا شہر کہا جاتا تھا اس کی پوری روداد سعید جاوید نے قلم بند کی ہے۔کراچی کے بازار، گلی، مضافات، تہذیب و تمدن، معاشرت، سماجی تقریبات، ثقافتی سرگرمیاں، کراچی میں اہم سیاسی اور عمومی واقعات، تعلیمی ادارے، اخبار و جرائد، شاعر اور ادیب، کھیل اور کھلاڑی، صداؤں اور رنگ و نور کی محفلیں، ریڈیو پاکستان،، ٹیلی ویژن، فلمی صنعت، صدر بازار، لالوکھیت، ناظم آباد، مزار قائد، بزنس روڈ فوڈ اسٹریٹ، منگھو پیر، چڑیا گھر، دھوبی گھاٹ اور اس کے علاوہ بہت کچھ اس کتاب میں موجود ہے۔

سعید جاوید نے اس دور کے واقعات، حادثات اور مشاہدات کا اس عمدگی اور خوبی سے ذکر کیا ہے کہ پڑھنے والا دم بخود رہ جاتا ہے۔ سچ کہوں تو یہ کتاب ویسی بالکل بھی نہیں تھی جیسا میں نے سوچا تھا۔یہ تو اس سے سوگنا دلچسپ، معلوماتی اور جاذب ہے۔سعید جاوید کو لفظوں سے کھیلنا خوب آگیا ہے، منظر کشی تو وہ ایسے کرتے ہیں کہ آپ ان کا انداز بیان دیکھ کر بے خود ہو جاتے ہیں۔لالوکھیت کی حقیقت بھی پہلی بار آشکار ہوئی۔حالانکہ خود میں کئی بار وہاں گیا اور ٹھہرا بھی تھا، لیکن مجھے اس کی تاریخ کے بارے کچھ علم نہ تھا۔پھر لیاقت آباد کے بدلے ہوئے نام نے لالوکھیت کے اس حشر نشر کو سنبھالا دیا جو معین اختر، نرالا اور لہری اس کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ہندوستان کی فضائیہ نے سن پینسٹھ کی جنگ میں جس طرح لالوکھیت کے ہوائی اڈے کو تباہ کیا تھا، اس کی منظر کشی بھی خوب کی ہے۔محبت واقعی دیکھ کر نہیں ہوتی، یہ ایک دفعہ ہو جائے تو پھر باقی رہتی ہے۔اگر کسی ثبوت کی ضرورت ہو تو ''ایسا تھا میرا کراچی'' پڑھ کر دیکھ لیجیے کہ محبت ہوئی تھی اور آج تک ہوئے جا رہی ہے۔''

یہ کراچی شہر کے بارے میں ایک معلوماتی، دلچسپ اور تاریخی کتاب ہے جو ہر پبلک لائبریری میں موجود ہونی چاہیے۔

اس کتاب کی اشاعت کا اہتمام بک ہوم کے چیئرمین رانا عبدالرحمن نے کیا ہے۔ایم سرور نے معیاری پروڈکشن، دیدہ زیب سرورق اور اعلیٰ کاغذ پر شائع کی گئی ہے۔کتاب مارکیٹ میں موجود ہے۔براہ راست منگوانے کے لیے بک ہوم بک سٹریٹ 46-مزنگ روڈ لاہور (فون: 042-37231518,37245072) سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

نام کتاب : نسرین انجم بھٹی/مصنف : زاہد مسعود/سن اشاعت : 2019ء/ قیمت : 800 روپے

ناشر : بک ہوم، بک سٹریٹ 46-مزنگ روڈ لاہور

زیر نظر کتاب ''نسرین انجم بھٹی'' معروف شاعر، ادیب اور کالم نگار زاہد مسعود کی تصنیف ہے۔زاہد مسعود نے اس کتاب میں اردو اور پنجابی کی ممتاز شاعرہ نسرین انجم بھٹی کی ادبی خدمات، ریڈیو پاکستان میں ان کی خدمات، سماجی خدمات، نسرین انجم بھٹی کی حالات زندگی، نسرین انجم بھٹی کی شخصیت، نسرین انجم بھٹی بطور پنجابی شاعرہ نسرین انجم بھٹی بطور اردو شاعرہ، نسرین انجم بھٹی سے ملاقاتیں اور خواتین کے حقوق کے لیے جدوجہد کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔اس کے علاوہ مصنف نے اس کتاب میں

ممتاز دانشوروں اور ادیبوں کے مضامین بھی شامل کیے ہیں جس میں نسرین انجم بھٹی کو خراج تحسین پیش کیا گیا ہے۔ ان میں مستنصر حسین تارڑ، قاضی جاوید، ستار سید، پروین ملک، مسعود منور، ڈاکٹر ناصر بلوچ، غلام حسین ساجد، خالد اصغر، شرجیل انظر، زاہد حسن، نوشین علی، پروفیسر سلیم الرحمٰن، حیدر عباس (ریڈیو کمپیئر)، استاد غلام حیدر خان، مشتاق صوفی، محمود اعوان، پروفیسر ڈاکٹر نوید شہزاد شامل ہیں۔ کتاب کے دوسرے حصے میں ان کی اردو اور پنجابی کی شاعری سے انتخاب کے علاوہ ان کا غیر مطبوعہ کلام بھی شامل کیا گیا ہے۔ اشاعتی ادارے بک ہوم نے نسرین انجم بھٹی کی سالگرہ کے موقع پر خصوصی طور پر شائع کی ہے۔ یہ کتاب نسرین انجم بھٹی کے دوست احباب اور ادبی حلقوں کے لیے ایک تحفے سے کم نہیں۔ ایسی کتاب ہر پبلک لائبریری کی زینت بنی چاہیے۔

اس کتاب کی اشاعت کا اہتمام بک ہوم کے چیئرمین رانا عبدالرحمٰن نے کیا ہے جب کہ ایم سرور نے معیاری پروڈکشن، دیدہ زیب سرورق اور اعلیٰ کاغذ پر شائع کی ہے۔ کتاب مارکیٹ میں موجود ہے۔ براہ راست منگوانے کے لیے بک ہوم بک سٹریٹ 46۔ مزنگ روڈ لاہور (فون: 042-37231518,37245072) سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

نام کتاب : فردیاتِ فرحت (اپنے شعروں کا انتخاب) / شاعر : ڈاکٹر فرحت عباس (راولپنڈی) / قیمت : 3500 روپے / تبصرہ نگار: ممتاز راشد لاہوری

ناشر : اہل قلم پبلی کیشنز پاکستان

ڈاکٹر فرحت عباس 20 دسمبر 1954ء کو ملتان میں پیدا ہوئے۔ وہیں پلے بڑھے، کچھ عرصہ بہاولپور میں گذارا اور پھر راولپنڈی کے ہو کر رہ گئے۔ وہاں اپنے میڈیکل کلینک کو چلانے کے علاوہ ادبی سرگرمیوں کو فروغ دینے کی محفلیں بھی کرتے رہتے ہیں۔ ان کی تا حال یہ کتب شائع ہو چکی ہیں: جھکتی پلکیں، زلفِ دراز، استعارہ، خزاں رسیدہ، فردیاتِ فرحت، مکالمات، مضامین فرحت اور مقامات فرحت۔ وہ کئی تنظیموں سے وابستہ ہیں اور کئی ایوارڈز اور اسناد و الوحات اعزاز بھی لے چکے ہیں۔ میں راولپنڈی میں بھی ان کی میزبانی سے استفادہ کر چکا ہوں۔ وہ لاہور آئیں تو بھی ملاقات رہتی ہے۔ 14۔ اپریل 2018ء کو "اشارہ انٹرنیشنل" نے نیشنل پریس کلب اسلام آباد میں اپنا جو تھا سالانہ مشاعرہ کرایا تو لاہور سے میں بھی مدعو تھا اور ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ وہیں ڈاکٹر فرحت عباس نے اپنا مجموعہ "فردیاتِ فرحت" عنایت کیا۔ اس میں ہر صفحے پر ان کے تین اشعار دیے گئے ہیں (کاش زیادہ ہوتے)۔ اس کتاب کے دیباچہ نگاروں میں ڈاکٹر منور ہاشمی، جمیل یوسف، ڈاکٹر قاسم بھوگیو، نسیم سحر، وفا چشتی، حسن عباس رضا، ڈاکٹر نثار ترابی، ڈاکٹر شفیق آصف، پروفیسر عرفان جمیل، ڈاکٹر محمد شاہین، سلیم شہزاد اور پروفیسر ناصر بشیر شامل ہیں۔ ان سب نے ڈاکٹر فرحت عباس کے فن و شخصیت کو خوب اجاگر کیا ہے۔ بعض نے منتخب اشعار بھی دیے ہیں بلاشبہ ڈاکٹر فرحت عباس کے اشعار میں ندرت، روانی اور شعریت کا عمدہ امتزاج ملتا ہے ۔۔۔ ع ۔۔۔ اللہ کرے زورِ بیاں اور زیادہ

نام کتاب : ناشکرے لوگ (ناول) / ناول نگار : اعجاز احمد فکرال / قیمت : 700 روپے / تبصرہ نگار: ممتاز راشد لاہوری

ناشر : علم و عرفان پبلشرز، الحمد مارکیٹ، اردو بازار لاہور

اعجاز احمد فکرال کا شمار لاہور کے معروف ادیبوں میں ہوتا ہے۔ ان کا ناول "ناشکرے لوگ" بڑی تقطیع کے صفحات والی کتاب کے طور پر آیا ہے۔ 320 صفحات کی یہ کتاب عمومی سائز کی کتاب کے 500 صفحات کے برابر تو ہوگی۔ عمومی معیار کی طباعت اور کاغذ والے اس مجلد ناول کا سرورق بغیر چہرے کی ایک تصویر ہے جس میں کالر والی قمیص پر میز پر میڑھی ٹائی بندھی ہوئی ہے اور آس پاس کچھ اشیاء بکھری نظر آتی ہیں۔ بیک ٹائٹل پر اُن کی ان چار کتب کے سرورق، عکسی صورت میں دیے گئے ہیں۔ 1۔ ناممکن سے ممکن تک 2۔ رنگین محبت کا غیر رنگی انجام 3۔ سُرخ تیل 4۔ ضرورت امن ۔۔۔ اعجاز فکرال نے اس ناول کا انتساب جاوید راہی اور کاشی چوہان کے نام کیا ہے۔ جاوید راہی روزنامہ "خبریں" لاہور میں فیچر رائیٹر ہیں۔ انھوں نے اس ناول کا ڈیڑھ صفحے کا دیباچہ لکھا ہے اور اسے یورپ کے ادیب والٹیئر کے حوالے سے اہم قرار دیا ہے۔ اعجاز احمد فکرال سرکاری ملازم ہیں۔ ان کی کہانیاں "سیارہ ڈائجسٹ" لاہور اور "سچی کہانیاں" کراچی وغیرہ میں شائع ہوئی ہیں۔ موخر الذکر نے انھیں 2016ء میں بیسٹ رائٹر کا ایوارڈ دیا تھا۔ ان کی تحریریں فکری انداز کی ہیں اور ہماری معاشرت کا بے لاگ تجزیہ کر کے حقیقی تصویر سامنے لانے کی کوشش کرتی ہیں۔ اس ناول کے تین بڑے حصے ہیں اور یہ کل 132 چھوٹے ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر باب اپنے طور پر بھی ایک کہانی صورت رکھتا ہے۔ اس ناول میں "ریڈ ایبلٹی" کا عنصر بھی نمایاں ہے اور فکر انگیزی کا بھی۔ ہماری تحریری دنیا میں ناول لکھنے کے کم ہوتے ہوئے رجحان میں ان کا یہ ناول یقیناً ایک خوشگوار لہر جیسا ہے۔ اعجاز فکرال سے بھی کبھار لاہور کی کسی نہ کسی ادبی محفل میں ملاقات ہو جاتی ہے۔ مجھے یہ ناول انھوں نے 27 نومبر 2017ء کو پاک ٹی ہاؤس لاہور کی ایک ادبی تقریب میں عنایت کیا تھا۔ اس گرانقدر ادبی تحفے کے لیے ان کا دلی شکریہ۔

نامہ ہائے احباب

مجسم تغزل، ارژنگ رنگ پیارے حسن صاحب

السلام علیکم۔ ارژنگ کی صورت گری سراپا ادبیت، شعریت ہے۔ آپ کی توجہ اور مہربانی سے بوئی کے سے دور کے گاؤں میں آپ لاہور سے مجلہ جریدہ بھیجتے ہیں۔ آپ شاعر بھی پائے کے اور اخلاص مند بھی اعلیٰ درجے کے ہیں۔ ایبٹ آباد کے دوست وحید بسمل کا کلام رسالے میں دیکھ کر خوشی ہوئی۔ ان کی کتاب میرے پاس موجود ہے۔ وہ خود کتاب دینے یہاں آئے تھے۔ کتاب کی حوالگی کی تصویر فیس بک پر آئی تھی۔

ارژنگ میں اہل قلم کے انٹرویو ایک قرینے سے پیش کیے جاتے ہیں۔ سلیم ساگر کی مصاحبت میں میرا کلام بھی رسالوں میں آتا رہتا ہے۔ سلیم ساگر نے غزل کو پانی پانی کر دیا۔ وہی روانی وہی مٹھاس، وہی از خود رفتگی ان کے ہاں موجود ہے۔ ارژنگ میں تحریروں کا تنوع حسن وخوبی سے بھرپور ہے۔

عامر بن علی کی خصوص میں ایم فل کا کام ہوا۔ مبارک ہو۔ عامر بن علی جاپان کے ''میاں چنوں'' ہیں۔ اللہ رکھے۔

آصف ثاقب، بوئی ہزارہ

محترم جناب حسن عباسی صاحب!

تسلیمات! ماہنامہ ارژنگ کی ہر ماہ ترسیل پر آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ کوشش کرتا ہوں کہ آپ کو تازہ کلام ارسال کروں۔ اس مرتبہ ''پاکستان فضائیہ کے لیے ایک نغمہ'' کے عنوان سے ایک نظم پیش خدمت ہے۔ اُمید ہے آپ اور ماہنامہ ارژنگ کے قارئین اور پاکستان کے عوام پسند فرمائیں گے۔

ارژنگ کی خوبصورت طباعت اور عمدہ مواد یقیناً لائق تحسین ہے۔

مظفر حسن منصور، خوشاب

گرامی قدر حسن عباسی صاحب!

اسلام علیکم۔ اُمید ہے مع اہل خانہ خیریت سے ہوں گے۔ آمین

آپ کے حکم کی تعمیل میں چند غزلیں جو غیر مطبوعہ ہیں برائے ''ارژنگ'' ارسال خدمت ہیں۔ جب اور جس ترتیب سے چاہیں چھاپ دیں۔

فقط دعا گو

نصرت صدیقی، فیصل آباد

محترم جناب حسن عباسی، مدیر ماہنامہ ''ارژنگ'' لاہور۔

اسلام علیکم۔ اُمید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

اپنی حال ہی میں شائع ہونے والی کتاب ارسال خدمت ہے۔ براہ کرم اس پر اپنے اخبار/رسالے میں تبصرہ کرادیں۔ آپ کا ممنون وشکر گزار رہوں گا۔

ڈاکٹر قاسم جلال، بہاولپور

محترم حسن عباسی جی! آداب!

''ارژنگ'' مسلسل مل رہا ہے۔ آپ کی کوشش اور کاوش بے مثال ہے کہ ادبی قبیلے کو یکجا کیا ہوا ہے۔ ''ارژنگ'' کی تمام شاعری اور نثر معیاری ہوتی ہے۔ ہر ماہ ملک بھر میں ہونے والی تقریبات اور دیگر ادبی سرگرمیوں کا پتہ چلتا ہے۔ ''ارژنگ'' کی مسلسل اشاعت سے آپ کے ادب دوست ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ میں ہمیشہ آپ کی کامیابی کے لیے دُعا گو ہوں۔

غزالی، گوجرہ

محترم حسن عباسی! آداب!

اُمید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ ایمبیسڈر کے مشاعرہ کے بعد بھی خط لکھا تھا غالباً ویسے مجھے یاد نہیں اس لیے کہ کافی عرصے سے ارژنگ کا دیدار نہیں ہوا۔ ابھی چھپنے کا شہرہ سنا۔ فیس بک پر ماشاءاللہ۔ ملا نہیں۔ ملے گا تو دوبارہ رسیدی خط ارسال کر دیں گے۔ دراصل ای میل کرنا مجھے مشکل لگتا ہے کہ مجھے خود آتا جاتا کچھ نہیں۔ میاں صاحب کی منت سماجت، ان کی اپنی آفیشل مصروفیات۔ خیر کوشش کروں گی کہ ای میل سے کچھ بھیجا کروں۔ کچھ لکھا کروں۔ لبنیٰ صفدر ماشاء اللہ بہت کام کر رہی ہیں۔ میرا اسلام عرض کیجیے گا۔ ایک غزل ''ارژنگ'' کے لیے پیش خدمت ہے۔

آسناتھ کنول، لاہور

محترم جناب حسن عباسی! السلام علیکم

نوائے وقت سنڈے میگزین میں تبصرہ کتب میں کافی غور سے پڑھتی ہوں۔ ایک کتاب جس کا عنوان ''مَن دا جوگی'' کے نام سے میں متاثر ہوئی اور نیچے درج فون نمبر پر فون کر کے بک آرڈر کر دی تو حسن عباسی جناب محترم سے بات ہوئی تو پتہ چلا کہ آپ ماہنامہ ارژنگ رسالہ نکال رہے ہیں۔ چونکہ ادب سے گہرا لگاؤ رکھنے کی وجہ سے منگوا لیا اور اپنا کلام بھی بھیجا۔ دو غزلیں شائع ہوئیں مگر مصروفیت کی بنا پر مکمل میگزین مطالعہ نہ کر پائی۔ آج ہی میگزین دوبارہ ہاتھ لگا تو میں نے اسے مکمل پڑھا۔ اس کی تحاریر اچھی لگیں۔ ننھا معمار، شیشہ و سنگ، دو وقت کی روٹی ایسے مضامین انسان کو سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ شاعری بھی تمام شعراء کرام کی اچھی کاوش ہے۔ انٹرویو میں ڈاکٹر امجد پرویز کا انٹرویو پڑھ کے حیرت بھی ہوئی۔ اچھا بھی لگا۔

شگفتہ گل، قصور

بڑا ادیب بننے کے لیے روایت شکن ہونا ضروری ہے

میرا خیال ہے کہ آنے والا دور نثری نظم کا دور ہوگا

معروف شاعرہ، کالم نویس اور ماہنامہ ارژنگ کی مدیرہ

لبنیٰ صفدر

سے حسن عباسی کی گفتگو

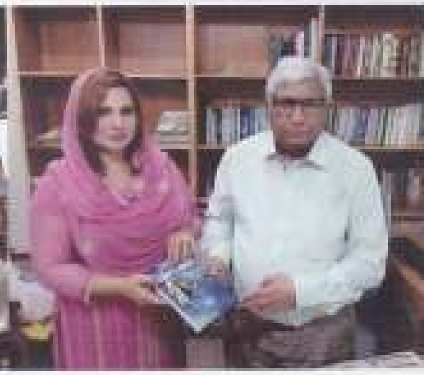

ادب کی فی زمانہ کیا اہمیت ہے؟

جس طرح ماضی کے ادب سے ہمیں پچھلی دنیا کے نہ صرف حالات و واقعات سے آگاہی ہوتی ہے۔ بلکہ اس وقت کے جغرافیائی، معاشی، معاشرتی و سیاسی اُتار چڑھاؤ بھی ہم پر آشکار ہوتے ہیں۔ میں سمجھتی ہوں ادب کسی بھی معاشرے کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ماضی میں جھانکنے والا ایک روزن ہے۔ مہذب قومیں اپنے ماضی سے پیوست رہتی ہیں اور ان کو کبھی فراموش نہیں کرتیں۔ زبان و بیان کی لطافتوں سے لے کر جذبات و احساسات کی واردات ہمیں بہترین ادب نے ہی مہیا کیے ہیں۔ دنیا کے اُتار چڑھاؤ میں بہت سی چیزوں میں تغیر و تبدل رونما ہوتا رہتا ہے لیکن ادب کی اہمیت و کردار کبھی نہیں بدلتے۔ آج کا حال کل کا ماضی ہوگا۔ ادب کی جو قدر و قیمت ہم نے یا ہمارے آباؤ اجداد نے محسوس کی اور اُس سے استفادہ حاصل کیا آنے والی نسلیں بھی کریں گی۔ اگر ہم مسلمانوں کی ہی بات کر لیں تو مسلمانوں کی یہ ادبی روایت اور اُس میں ادب کا کردار پہلی صدی ہجری سے لے کر آج تک جاری ہے۔ وہ ایک ادیب ہی تھا جس نے اعلان کیا کہ کافروں کے ''الزام کے مطابق اگر حسینؑ کافر ہیں تو ہم بھی کافر ہیں'' یہی ثابت قدمی اور وفا شعاری رموزِ عشق سے آگاہ کرتی ہے۔ ادب کی اہمیت آج، کل اور ہمیشہ رہے گی۔

(مکمل انٹرویو اندرونی صفحات)